ایمان و عمل کا قرآنی تصور

الطاف احمد اعظمی

Marfat.com

ایمان و عمل کا قرآنی تصور

الطاف احمد اعظمی (علیگ)

دارالتذکیر

Marfat.com

۲۹۷
۱۵۷۹۱
۷۰۱۵۹

جملہ حقوق محفوظ ہیں

○ اہتمام : محمد احسن تہامی

○ مطبع : گنج شکر پرنٹرز

○ تاریخ اشاعت : 2006

○ قیمت : 200 روپے

دار التذکیر

رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار

لاہور۔54000 فون : 7231119

ای میل: info@dar-ut-tazkeer.com

ویب سائٹ: www.dar-ut-tazkeer.com

Marfat.com

فہرست مضامین

- • کتاب میری نظر میں — سید جلال الدین عمری ۶
- ۔ دیباچہ ۸
- ۔ مقدمہ ۱۴
- ۱۔ ایمان کے لغوی معنی ۲۳
- ۲۔ ایمان کے قرآنی معنی ۲۵
- ۳۔ ایمان کا شرعی مفہوم ۲۹
- ۴۔ تکمیلِ ایمان کے شرائط ۳۰
- تصدیق بالقلب ۳۱
- اقرار باللسان ۳۶
- اثبات بالعمل ۴۰
- ۵۔ ایمان کے اجزائے ترکیبی ۴۵
- ۶۔ اجزائے ایمان کی مختصر تشریح ۴۷
- (الف) ایمان باللہ ۴۸
- تصور ذات ۴۸
- تعبیرات کا اختلاف ۵۵
- تصور صفات ۵۷
- نفی صفات ۵۹
- اثبات صفات ۵۹
- قرآن کا تصور صفات ۶۰
- ایمان باللہ کے تقاضے ۶۲
- (ب) فرشتوں پر ایمان ۶۴
- (ج) رسولوں پر ایمان۔ ثبوت رسالت ۶۸
- تفریق بین الرسل ۷۷
- ایلچی کی حیثیت اور اس کا فرضِ منصبی ۷۸
- اطاعت رسول ۸۲
- احادیث رسول ۸۳
- مجموعۂ احادیث ۸۵
- سنّت رسول ۸۸
- (د) کتابوں پر ایمان ۹۲
- ایمان بالکتب کے تقاضے ۹۳
- (ہ) آخرت پر ایمان ۹۷
- روزِ جزا کا مفہوم ۹۷
- نتائجِ اعمال سے غفلت کے اسباب ۱۰۱
- آخرت کے بارے میں ملحدین کا نقطۂ نظر ۱۰۱
- اثبات معاد ۱۰۳
- خلق اوّل ۱۰۳
- آثار کائنات ۱۰۵
- زوجیت کا مقتضا ۱۰۶
- عدل کامل کا تقاضا ۱۰۸
- عقیدۂ آخرت ایک اخلاقی و سماجی ضرورت ۱۰۹
- ضمیر کا وجود ۱۱۰
- دائمی مسرت کی فطری طلب ۱۱۲
- عقیدۂ آخرت کے متعلق بعض غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ ۱۱۴
- ۷۔ حقیقتِ اسلام ۱۲۴
- اسلام کا لغوی مفہوم ۱۲۴
- اسلام دین فطرت ہے ۱۲۵
- مسلم کے حقیقی معنی ۱۲۸
- اسلام کا شرعی مفہوم ۱۳۰

Marfat.com

ایمان اور اسلام میں تلازم ہے ۱۳۳
ہدایت اور فلاح کا حقیقی معیار ۱۳۶
۸۔ درجات ایمان ۱۴۰
۹۔ ایمان میں کمی و بیشی کا مسئلہ ۱۴۷
۱۰۔ صفاتِ مومن ۱۵۲
یقین محکم اور جہد و ایثار ۱۵۴
اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ ۱۵۶
خشیت قلب اور توکل علی اللہ ۱۶۱
گناہ کبیرہ سے اجتناب، عفو و درگزر اور مشاورت ۱۶۳
امر بالمعروف و نہی عن المنکر ۱۶۵
صبر، صدق، قنوت، انفاق اور استغفار ۱۶۸
خشوع صلوٰۃ، محافظت صلوٰۃ، پاک دامنی، امانت و دیانت، ایفاء عہد، قیام شہادت ۱۷۴
محبت الٰہی ۱۷۷
حسن اخلاق ۱۸۱
۱۱۔ مومن اور منافق میں فرق ۱۸۴
علامات منافق - شک اور تردّد ۱۸۵
اقامت صلوٰۃ میں ریا و غفلت ۱۸۸
ایتاء زکوٰۃ میں غفلت و بددلی ۱۸۹
امر بالمنکر و نہی عن المعروف، بخل اور ذکر الٰہی سے غفلت ۱۹۱
جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی۔ ۱۹۳
اقسام منافقین ۱۹۴
۱۲۔ عمل کا مفہوم ۔ ۱۳۔ اقسام عمل ۱۹۶
۱۴۔ عمل صالح کا مفہوم ۱۹۷
بہترین عمل صالح ۲۰۲
عمل صالح اور عہدِ حاضر کے مسلمان ۲۰۴
کیا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں؟ ۲۰۶
اعمال جزو ایمان ہیں ۲۰۸
قرآن مجید سے استشہاد ۲۰۹
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۱۷
احادیث سے استشہاد ۲۱۹
علماء اسلام کی تحریروں سے استشہاد ۲۲۲
۱۵۔ جزائے اعمال ۲۲۴
(الف) دنیوی جزا ۲۲۵
(ب) اخروی جزا ۲۲۹
اُخروی جزا کا مادی تصور ۲۳۰
اخروی جزا کے مادّی تصور کی حقیقت ۲۳۴
اُخروی جزا کا غیر مادّی تصور ۲۳۶
۱۶۔ عمل غیر صالح کا مفہوم ۲۳۸
کیا ایمان کے ساتھ اعمال غیر صالحہ کا اجتماع ممکن ہے؟ ۲۳۸
توبہ و استغفار ۲۴۰
گناہ کبیرہ اور توبہ و استغفار ۲۴۶
گناہ کبیرہ اور خوارج و معتزلہ کا نقطۂ نظر ۲۴۸
۱۷۔ عمل غیر صالح کی سزا ۲۵۲
دنیوی سزا ۲۵۲
اسلامی سزاؤں کی حقیقت ۲۵۵
اخروی سزا ۲۶۷
جہنم کی سزائیں کن لوگوں کے لیے ہیں ۲۶۹
اخروی سزا کا مادی پہلو ۲۶۹
جہنم کی حقیقت ۲۷۳
کیا جہنم بھی خدا کی رحمت ہے؟ ۲۷۷

Marfat.com

انتساب

میری والدہ صغریٰ خانم ایک نہایت ہی نیک نفس اور صابرہ خاتون تھیں۔ ان کی نیک نفسی اور صبر و تحمل گھر اور خاندان میں ضرب المثل تھا میں ابھی ایام طفلی کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ وہ اس دار فانی سے رحلت کر گئیں۔ یہ حادثہ میرے لیے بڑا جانکاہ تھا۔

ان کی یاد اور ان کا تصوّر عمر گزشتہ کی طرح عمر رواں کی ہر منزل میں شریک سفر رہے گا۔ میں اس کتاب کو ان کے نیک نام سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

الطاف احمد اعظمی (علیگ)

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب ۔ میری نظر میں

دین نام ہے ایمان اور عمل صالح کا ۔ اسلام نے دنیا اور آخرت کی تمام خوش خبریاں ان ہی دو خوبیوں پر دی ہیں ۔ ضرورت تھی کہ علمی اور بالکل فطری انداز میں ان خوبیوں کی بھرپور وضاحت کی جاتی اور ان کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انھیں رفع کیا جاتا ۔ ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی قیمتی ہے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرتی ہے ۔ اس میں مصنف نے بڑے دل نشیں انداز میں ایمانیات کی تشریح کی ہے اور قرآن کے دلائل کو بہترین اسلوب میں پیش فرمایا ہے ۔ عمل صالح ایمان کا ایک لازمی تقاضا ہے ۔ ایمان جب دل کی گہرائی میں اترتا ہے تو پوری زندگی میں عمل صالح کی بہار آجاتی ہے اور انسان کی عبادت اور اخلاق سے لے کر معاشرت اور سیاست تک تمام معاملات میں نیکی اور تقویٰ کا ظہور ہونے لگتا ہے ۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ دعویٰ ایمان کے باوجود اگر کسی کی زندگی میں اعمال صالحہ کی آب و تاب نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ معاصی کا ارتکاب کر رہا ہے تو کیا اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو گیا اور روز جزا جنت کا مستحق نہیں رہا ؟ یا یہ کہ لازماً اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا ؟ اس سوال پر ہمارے قدماء نے بڑی بحثیں کی ہیں ۔ اس مسئلہ میں جمہور امت نے ایک خاص نقطۂ نظر اپنایا ہے ۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے درمیان اتنا گہرا رشتہ ہے کہ اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان میں سے ایک پایا جائے اور دوسرا نہ پایا جائے ۔ دل میں ایمان موجود ہو اور زندگی عمل صالح سے خالی ہو ۔ یہ بات ایک مومن کی شان کے بالکل خلاف ہے کہ وہ معصیت کی زندگی گزارتا رہے ۔ اس پر قرآن مجید اور احادیث میں سخت وعید آئی ہے ۔ بعض آیات و احادیث سے بظاہر یہ خیال بھی ہوتا ہے

Marfat.com

کہ جو شخص کبائر کا ارتکاب کرے اس کے ایمان ہی کا کوئی اعتبار نہیں ہے لیکن دوسری آیات و احادیث بتاتی ہیں کہ وہ بہرحال مومن ہے۔ بے عملی یا معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے وہ دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوجاتا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف بھی کرسکتا ہے اور ان پر سزا بھی دے سکتا ہے۔ اس کی سزا ابدی جہنم نہ ہوگی وہ اپنے غلط کاموں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت کا مستحق ہوگا۔ مصنف نے اس مسئلہ میں جو نقطۂ نظر اپنایا ہے وہ جمہور کے نقطۂ نظر سے بڑی حد تک مختلف ہے اسے انھوں نے قرآن و حدیث سے مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن خود ان کے نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ علمی مسائل میں اختلاف ناروا نہیں ہے اس سے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں اور کسی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

جمہور کے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت یا وکالت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر قرآن مجید نے ایمان کے جن تقاضوں کا ذکر کیا ہے مصنف نے انھیں ایک خاص ترتیب اور سلیقے کے ساتھ اور بہت ہی پرزور طریقے سے پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں انداز بیان میں شدت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شدت مصنف کے جوش ایمان اور جذبۂ اصلاح کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس پہلو سے خوشی ہے کہ انھوں نے ایمان کے تقاضوں کو ابھار کر ہمارے سامنے ایک آئینہ فراہم کردیا ہے جس میں ہم جیسے گنہگار اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے تاکہ ایمان اور عمل صالح کی روشنی عام ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے اس کے دین کے تقاضے پورے کریں۔

سید جلال الدین عمری
سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

۴ر اگست ۱۹۸۶ء

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

جہاں تک ایمان وعمل کے لفظ کا تعلق ہے اس سے کوئی بھی مسلمان ناواقف نہ ہوگا۔ لیکن اس کے معنی ومفہوم سے صحیح طور پر واقف کم ہی مسلمان ملیں گے۔ بہت سے مذہبی لوگ بھی ایمان و عمل کے حقیقی (قرآنی) معنی ومفہوم سے نابلد ملتے ہیں۔ اور یہ غالباً اسی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی زندگیاں بھی بڑی حد تک مومنانہ اوصاف وخصائص سے تہی دامن نظر آتی ہیں۔

بہت سے ایسے مسلمان بھی ملتے ہیں جو ایمان وعمل کا ایک ایسا تصوّر رکھتے ہیں جو قرآنی تعلیمات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس غیر قرآنی تصوّر ایمان کو ان کے قلب ودماغ میں کچھ اس طرح پیوست کر دیا گیا ہے کہ وہ اس کی صحت وصداقت پر کامل یقین رکھتے ہیں، اور اس سے کسی قیمت پر دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ ایمان وعمل کے اس غیر قرآنی تصوّر ہی کی وجہ سے ان کی اکثریت افکار واعمال کی بے شمار خرابیوں میں مبتلا ہے حتیٰ کہ گناہ عظیم یعنی شرک سے بھی ان کا دامن داغدار ہے۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کا وجود اور ان کے باہمی نزاع وپیکار کا ایک بڑا سبب بھی ایمان وعمل کا یہی غیر قرآنی تصوّر ہے۔

یہ صورت حال ہر دردمند مسلمان کے لیے سخت اضطراب انگیز ہونی ہی چاہیئے۔ میرے لیے بھی فکر کا باعث تھی اور میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کیوں نہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ایمان وعمل سے متعلق قرآنی تصورات کو کسی افراط وتفریط کے بغیر واضح لفظوں میں بیان کر دیا جائے تاکہ جو لوگ اس کے حقیقی معنی ومفہوم کو نہ جانتے ہوں وہ اس کو جان لیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح وتہذیب کریں، اور جو لوگ اس کے معنی ومفہوم کی غلط تاویل و

Marfat.com

تشریح کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اپنے طرز فکر کی غلطی کو محسوس کر لیں بلکہ ایمان و عمل کے حقیقی قرآنی تصور کے مطابق اپنے افکار و اعمال کی اصلاح بھی کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا جو پلک جھپکتے ہی انجام پا جاتا، اس کے لیے بڑی جاں سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت تھی۔ میں نے جب بھی اس راہ میں اقدام کا فیصلہ کیا، علمی کم مائگی اور بے بضاعتی کا احساس مانع راہ بن گیا، اور اس طرح یہ کام برسوں معرض التواء میں پڑا رہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے میرا ذہنی و فکری رشتہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ میں برابر غور و فکر مطالعہ، اور اپنے منتشر فکری سرمائے کی جمع و تالیف میں مشغول رہا۔ حالات کی نزاکت اور موضوع سے گہری قلبی وابستگی نے تمام موانع راہ کے باوجود بالآخر مجھ کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اسے محض تائید ایزدی اور نصرت خداوندی کا ثمرہ کہیے کہ دو سال کی قلیل مدت میں یہ کام بحسن و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ والحمد للہ۔

اس کتاب کا موضوع جیسا کہ بیان ہو چکا، ایمان و عمل ہے۔ کتاب میں سب سے پہلے ایمان و عمل کے لغوی و قرآنی اور اس کے شرعی مفہوم کو قرآنی آیات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لفظی شرح و تفصیل کے بعد ایمان کے اجزائے ترکیبی یعنی دین کے بنیادی اصولوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایمانیات کا تعلق عالم غیب کے غیر مرئی اور نامشہود حقائق سے ہے، اور ان میں عقل انسانی کے لیے گنجائش کلام بہت کم ہے پھر بھی موجودہ دور کے انداز فکر کا تقاضا یہی ہے کہ ان غیبی امور کو عقلی دلائل و شواہد کی روشنی میں جدید اسلوب میں پیش کیا جائے تاکہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی ان غیبی امور کی تفہیم آسان ہو جائے۔

میں نے ایمان کے اجزائے ترکیبی کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے تقاضوں کی بھی تشریح و توضیح کر دی ہے۔ فی الواقع ایمان کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت کے وقوع پر دل سے یقین رکھا جائے اور زبان سے ان کا اقرار کیا جائے، بلکہ ان کے تقاضوں کو جاننا اور ان پر عمل کرنا بھی ایمان میں داخل ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے اقرار ایمان کرتا ہے لیکن اس کے عملی

Marfat.com

تقاضوں کو نظر انداز کر دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو وہ ایمان کے معنی و مفہوم سے بالکل ناواقف ہے، اور یا اس کا اقرارِ ایمان محض زبانی ہے، اور ابھی تک اس کے قلب و دماغ حلاوت ایمان سے ناآشنا ہیں۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمارے بعض اکابر علماء اور فقہاء ایمان و عمل کے لزوم کو تسلیم نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ عمل ایمان کا جزو لازم نہیں ہے بلکہ اس سے علیحدہ ایک چیز ہے، اور عمل میں کمی یا اس کے فقدان سے ایمان پر فی نفسہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میری حقیر فہم کے مطابق یہ تصوّرِ ایمان و عمل سراسر قرآنی تعلیم کے خلاف اور اُمّت مسلمہ کے حق میں سخت مضرت رساں ہے۔ میں نے قرآن مجید اور صحیح احادیث کی روشنی میں ایمان و عمل کے ربط و تعلق کو واضح بھی کیا ہے اور اسے مبرہن کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ بھی ہمارے یہاں ایک اختلافی مسئلہ ہے لیکن یہ اختلاف بھی دراصل لفظ ایمان کی غلط تشریح و تاویل کا نتیجہ ہے۔ میں نے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اس اختلاف کا جائزہ لے کر امر حق کو واضح کیا ہے۔

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک مومن و منافق کی پہچان کا ذریعہ ان کے اعمال و خصائل ہیں۔ میں نے قرآنی آیات کی روشنی میں مومن و منافق کے اوصاف و خصائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ ہر مقرِّ ایمان اپنی داخلی اور خارجی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھ سکے کہ اس کے ایمان کا کیا حال ہے، اور کہاں تک نفاق کے اثرات سے اس کی زندگی کے شب و روز محفوظ ہیں۔

اسلام میں عقیدۂ آخرت کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ قرآن میں توحید کے بعد جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ عقیدۂ آخرت ہے، کیوں کہ انہی دو عقائد کی درستگی سے ایک انسان دنیا اور آخرت دونوں میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں ایک صالح معاشرہ اور عادلانہ نظام حیات کا قیام بھی عقیدۂ آخرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جو انسانی معاشرہ بھی عقیدۂ آخرت کے تصور سے خالی ہوگا وہ ایک شجر بے برگ و بار ہوگا، اور اس میں انسانوں کو کبھی حقیقی راحت و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

عقیدۂ آخرت کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، اور حیات بعد موت کے تصوّر کو ایک امر یقینی کے طور پر اس انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے محصلین کے لیے بھی اطمینان بخش ثابت ہو سکے۔

انسانی زندگی پر عقیدۂ آخرت کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں اس سے انکار ممکن نہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یوم آخرت پر ایمان رکھنے کے باوجود مسلمانوں کی بڑی تعداد ہر طرح کی بداعمالیوں میں مبتلا ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک بڑی وجہ عقیدۂ شفاعت کا غلط تصوّر ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ، شفاعت کا ایک ایسا تصوّر رکھتا ہے جو قرآن مجید کے تصوّر شفاعت کے بالکل خلاف ہے اور اُخروی زندگی کے لیے موجب ہلاکت بھی۔ میں نے قرآنی آیات کی روشنی میں نہ صرف اس تصوّر شفاعت کی نفی کی ہے بلکہ اس کے صحیح تصوّر کو بھی پیش کیا ہے۔

حیات بعد موت کے ذکر کے ساتھ اعمال کی جزا و سزا کا ذکر ناگزیر ہے۔ جزا و سزا کا دوسرا اصطلاحی نام جنّت اور جہنّم ہے۔ جنّت اور جہنّم کا نام آتے ہی بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فی الواقع جنّت اور جہنّم سے قرآن مجید کی مراد کیا ہے؟ کیا جنت اور اس کی نعمتوں سے مراد وہی نعمتیں ہیں جن سے انسان اس دنیا میں واقف ہے یا اس کا مفہوم کچھ اور ہے؟ اسی طرح جہنّم اور اس کی آگ سے کیا وہی آگ مراد ہے جو ہمارے گھروں کے چولھوں میں جلتی ہے یا اس سے قرآن کی مراد کچھ اور ہے؟ میں نے ان دونوں پیچیدہ سوالوں کا جواب قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کی تسکینِ قلب و دماغ کا وافر سامان موجود ہے۔

یہ تھے وہ بڑے موضوعات جن پر اس کتاب میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اہم علمی موضوعات بھی ضمناً زیر بحث آئے ہیں جن سے انشاء اللہ قارئین کو فائدہ پہنچے گا۔

میں نے اس کتاب کے شروع میں دیباچہ سے ٹھیک متصل "مقدمہ" کے عنوان سے ایمان اور عمل صالح سے متعلق اہل کتاب کے افکار و اعمال کا مختصراً جائزہ لیا ہے اور

Marfat.com

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کے تصوّرِ ایمان و عمل کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کردیا ہے تاکہ قارئین، کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے موضوع کتاب کی حقیقت و اہمیت سے ایک حد تک واقف ہوجائیں، اور یہ بھی جان لیں کہ ایمان اور عمل صالح کے باب میں اہل کتاب کا نقطۂ نظر کیا ہے، اور فکری و عملی اعتبار سے وہ کس طرح کے فسق و ضلالت میں مبتلا ہیں؟ اور اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو دور رس فکری و عملی اصلاحات کی ہیں ان کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟ اور یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ اصلاحیں کس درجہ واضح، مدلل اور متوازن ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو بعض مقامات پر مسلمانوں کے موجودہ طرزِ فکر و عمل پر تنقید و تبصرہ بھی ملے گا کہیں کہیں اس تنقید و تبصرہ کا رخ علماء کرام کی طرف ہوگیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ الفاظ اور انداز بیان کے اعتبار سے یہ تنقید کچھ تیز و تند ہوگئی ہو لیکن حاشا وکلا اس سے میرا مقصود ان کی توہین و تحقیر نہیں ہے، بلکہ ان کو محض اس امر کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ملت کے قلب و دماغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے طرزِ فکر و عمل کی اصلاح کرلیں تو عامۃ المسلمین کے افکار و اعمال کی اصلاح بہت آسان ہے۔

میں کسی قسم کے پندارِ زہد و تقویٰ اور کسی نوع کے فریبِ ہمہ دانی میں مبتلا نہیں ہوں۔ میں ایک نہایت ہی حقیر اور خطاکار انسان ہوں اور خود کو قرآن مجید کا ایک معمولی طالب علم سمجھتا ہوں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہر طرح کی احتیاط اور غور و فکر کے باوجود کتاب میں علمی فروگزاشتیں موجود ہوں۔ میں قارئین بالخصوص علماء کرام سے درخواست کروں گا کہ وہ اس کتاب کا غیر جانبدارانہ اور معروضی مطالعہ کریں اور اس میں جو علمی فروگزاشتیں نظر آئیں ان سے مجھے ضرور مطلع فرمائیں، میں ان کا بے حد ممنون ہوں گا۔

میں ان تمام احباب اور بزرگوں کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کے لکھنے میں مجھے کسی طرح کا کوئی تعاون دیا ہے، بالخصوص میں مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا بدرالدین اصلاحی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان دو فاضل بزرگوں نے اپنے گوناگوں علمی مشاغل کے باوجود کتاب کا مسودہ دیکھا اور اپنے گراں قدر مشوروں

Marfat.com

سے نوازا۔ میں مولانا سید جلال الدین عمری (مدیر تحقیقات اسلامی، علی گڑھ) کا بھی بے حد ممنون ہوں، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کی بلکہ اس کی اشاعت کا بھی انتظام کیا۔ میں جناب راشد اعظمی کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان سب محبین و مخلصین کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس "سعی ناچیز" کو شرف قبول بخشے، اسے قارئین کے حق میں زیادہ سے زیادہ نافع بنائے، اور مجھ روسیاہ کو مزید خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

الطاف احمد اعظمی
محلہ اجمیری۔ جونپور
۲۸ر جنوری ۱۹۸۴ء

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

خدا کی طرف سے مختلف ادوار میں جو ادیان آئے ان کی جملہ تعلیمات کو دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک ایمان کا خانہ اور دوسرا عمل صالح کا۔ ایمان، دین کے بنیادی اصولوں پر دل سے یقین رکھنے کو کہتے ہیں، اور یہ اصول بنیادی طور پر تین ہیں[1]: ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ۔ اور انہی اصول ثلاثہ کے مطابق عمل کرنے کا نام عمل صالح ہے۔

ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں ربط و تعلق کی نوعیت وہی ہے جو ایک عمارت کی بنیاد اور اس کے در و دیوار میں ہوتی ہے۔ ایمان بمنزلہ بنیاد کے ہے اور عمل صالح بمنزلہ در و دیوار اور ستون کے۔ ہر عمارت اپنے وجود کے لیے بنیاد اور دیوار و ستون دونوں کی محتاج ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک بھی موجود نہ ہو تو عمارت کا وجود بھی نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح دین کی عمارت بھی نہ تو ایمان کے بغیر قائم ہو سکتی ہے اور نہ عمل صالح ہی کے بغیر کھڑی ہو سکتی ہے۔

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی کسان صرف زراعت کے اصولوں سے واقف ہو کر اپنے کھیت سے غلہ پیدا نہیں کر سکتا ہے، بلکہ کھیت سے اسی صورت میں غلہ پیدا ہو گا جب کسان زراعت کے اصولوں کے مطابق عمل بھی کرے گا، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف دین کے اصولوں سے واقفیت اور ان کے زبانی اقرار سے اس کے بہترین ثمرات ظاہر

---

[1] ایمان کے دو رکن یعنی ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب، ایمان بالرسل ہی میں شامل ہیں۔ جملہ کتب سماویہ کا نزول ایک فرشتہ (جبرئیل) ہی کے توسط سے ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ ناگزیر طور پر فرشتوں اور کتابوں پر بھی ایمان رکھے گا۔ (مصنف)

Marfat.com

نہیں ہو سکتے۔ ایمان صرف اسی صورت میں نافع بن سکتا ہے جب کہ اس کے مطابق ٹھیک عمل ہو۔

ابتدا میں ہر دین کے ماننے والوں نے ایمان اور عمل صالح کے لازمی تعلق کو برقرار رکھا، لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے انھوں نے نہ صرف اس ربط و تعلق کو قائم نہیں رکھا بلکہ ایمان اور عمل صالح کی حقیقت اور ان کے تقاضوں کو بھی فراموش کر دیا۔ دین میں اس افراط و تفریط کی مرتکب قوموں میں سے یہودی اور عیسائی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

یہودیوں نے سب سے زیادہ زور اعمال بالخصوص اعمال قربانی پر دیا[۱] اور ایمان کو بالکل ثانوی حیثیت دے دی۔ ارکان ایمان یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ میں سے آخر الذکر دو ارکان کو بڑی حد تک بھلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تورات کے صفحات میں ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ کی حقیقت اور ان کے تقاضوں کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے، ایمان باللہ کا ذکر تورات میں ضرور ہے لیکن یہودی من حیث القوم اس کی حقیقت اور اس کے تقاضوں کو اپنی تاریخ کے کسی دور میں بھی مکمل طور پر محفوظ نہ رکھ سکے۔ اس باب میں ان کی غفلت کوشی اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ بت پرستی تک میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی بت پرستی پر تورات کے صفحات آج بھی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت یسعیاہ فرماتے ہیں:

"وہ اہلِ مشرق کے رسوم سے پر ہیں اور فلستیوں کی مانند شگون لیتے ہیں ..... اور ان کی سرزمین بتوں سے بھی پر ہے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کی صنعت یعنی اپنی ہی انگلیوں کی کاریگری کو سجدہ کرتے ہیں"[۲]

ایک دوسری جگہ تمثیل کے پیرایہ میں ان کی بت پرستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"خداوند نے مجھ سے فرمایا، کیا تو نے دیکھا کہ برگشتہ اسرائیل (یعنی سامریہ کی اسرائیلی ریاست) نے کیا کیا؟ وہ ہر ایک اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک درخت کے نیچے گئی اور وہاں بدکاری (یعنی بت پرستی) کی ..... اور اس کی بے وفا

---

[۱] احبار باب ۱ تا ۱۰ [۲] یسعیاہ باب ۲: آیات ۶-۸

بہن یہوداہ (یعنی یروشلم کی یہودی ریاست) نے یہ حال دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ جب برگشتہ اسرائیل کی زناکاری (یعنی شرک) کے سبب سے میں نے اس کو طلاق دے دی اور اسے طلاق نامہ لکھ دیا (یعنی اپنی رحمت سے محروم کر دیا) تو بھی اس کی بے وفا بہن یہوداہ نہ ڈری بلکہ اس نے بھی جا کر بدکاری کی اور اپنی بدکاری کی برائی سے زمین کو ناپاک کیا، اور پتھر اور لکڑی کے ساتھ زناکاری (یعنی بت پرستی) کی"۔[1]

ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے یہودیوں نے اعمالِ صالحہ کے معاملے میں بھی بدترین غفلت کا ثبوت دیا اور نفس پرستی کی راہ پر چل پڑے۔ یسیعاہ نبی نے ان کی بداعمالیوں کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے:

"آہ خطاکار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، مکّار اولاد، جنھوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے قدّوس کو حقیر جانا اور گمراہ و برگشتہ ہو گئے۔ تم کیوں زیادہ بغاوت کر کے اور مار کھاؤ گے"۔[2]

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"وفادار بستی کیسی بدکار ہو گئی، وہ تو انصاف سے معمور تھی اور اس میں راستبازی بستی تھی لیکن اب خونی رہتے ہیں ...... تیرے سردار گردن کش اور چوروں کے ساتھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہنچتی"۔[3]

یہودیوں کی طرح عیسائی بھی ایمان اور عمل صالح کے باب میں افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہے۔ یہودیوں کے برخلاف انھوں نے ایمان، بالخصوص ایمان باللہ کو اہم قرار دیا، اور اس کے دوسرے اجزا یعنی ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔[4] ایمان بالرسل تو یوں غیر اہم ہو گیا کہ انھوں نے خود عیسیٰؑ کو ایمان باللہ میں شریک کر لیا اور

---

[1] یرمیاہ باب ۳ آیات ۶ تا ۹

[2] اناجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی (مصنف)

[3] یسیعاہ باب ۱ آیات ۱ تا ۲۳

[4] اناجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی (مصنف)

ایمان بالآخرۃ کی ضرورت اس لیے باقی نہ رہی کہ عیسیٰؑ نے مصلوب ہوکر نہ صرف عیسائیوں بلکہ کل بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا (یوحنا ۲:۲) اب لے دے کے صرف ایمان باللہ بچا لیکن وہ بھی جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، خالص نہ رہا۔ انھوں نے اللہ کے ساتھ دو اور ہستیوں (بیٹا اور روح القدس) کو شریک الوہیت کر کے عقیدۂ تثلیث ایجاد کر لیا، اور صرف اسی عقیدے سے فکری و قلبی وابستگی کو ہدایت اور نجات اخروی کا ذریعہ قرار دیا ہے، رہے اعمال صالحہ تو وہ ہدایت اور فلاح آخرت کے نقطۂ نظر سے بالکل غیر ضروری ٹھہرے[1] اس سلسلے میں دور جدید کے ایک عیسائی فاضل کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتا ہے:

"آپ بہترین راستبازی کی زندگی بسر کریں، جتنے بھلے کام کر سکتے ہیں کریں، سنہرے اصول کی پابندی کریں، جو بہترین کام آپ کر سکتے ہیں وہ کریں، ان سب سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ زندگی اچھے اعمال سے نہیں ملتی۔ کوئی زیارت، کوئی دعا، کوئی سخاوت، کچھ بھی جو آپ کر سکتے ہیں فائدہ مند ثابت نہ ہوگا"[2]

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"تعلیم، اصول، دعائیں، خود انکاری، ماتم، توبہ اور خیرات گو کہ کچھ فائدہ مند ضرور ہیں لیکن یہ اعمال آپ کو نجات نہیں دے سکتے ہیں...... اور نہ کسی دوسرے وسیلہ سے آپ نجات پا سکتے ہیں (اعمال ۴: ۱۲) آپ کو صرف مسیح اور صرف مسیح نجات دے سکتا ہے"[2]

اعمال صالحہ کے انکار اور نجات اخروی کو صرف عیسیٰؑ مسیح سے وابستہ کر دینے کے جو لازمی نتائج نکلنے چاہئیں وہ آج آپ بچشم سر دیکھ سکتے ہیں۔ ایمان میں صریح شرک

---

[1] دیکھئے پال کے خطوط رومیوں کے نام ۳، ۴ (اناجیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ مصنف)

[2] THE SALVATION OF GOD P 72-73

(DR. OSWARD. J. SMITH L.L.D)

Marfat.com

داخل ہو گیا ہے، اور اعمال کا حال یہ ہے کہ اب سور کا گوشت، شراب اور زنا جیسے اعمال ان کی نظروں میں اعمال بد نہ رہے: فاعتبروا یا اولی الابصار۔

خدا کے آخری دین کی حیثیت سے دین اسلام نے آکر ایمان و عمل صالح اور ہدایت و نجات اُخروی کے سلسلے میں یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر اقوام عالم کے گم راہ کن اور مشرکانہ خیالات کی تردید کی، اور وہ راہ بتائی جس پر چل کر تمام انسان خواہ وہ کسی بھی ملک و قوم اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں، دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلام نے سب سے پہلے ایمان اور عمل صالح کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کو واضح کیا۔ اس نے بتایا کہ ہدایت اور روز آخرت کامیابی کا مدار نہ صرف ایمان پر ہے اور نہ صرف عمل صالح پر، بلکہ ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (بقرہ: ۶۲)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو ان کے لیے خوف کی کوئی بات ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝ (مریم: ۶۰)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفسانی کا اتباع کیا پس وہ عنقریب گمراہی سے دوچار ہوں گے، لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان کا ذرا سا

Marfat.com

حق نہ مارا جائے گا۔

ہدایت اور فلاح آخرت کو ایمان اور عمل صالح پر منحصر قرار دینے کے ساتھ ہی اسلام نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال باطل کی بھی تردید کی کہ ہدایت اور جنت کا حصول یہودی یا عیسائی بنے بغیر ممکن نہیں ہے، فرمایا:۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ (البقرہ: ۱۳۵)

یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہو، نہیں، بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ (البقرہ: ۱۱۱، ۱۱۲)

وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان لوگوں کی امنگیں اور آرزوئیں ہیں (نہ کہ حقیقت حال) ان سے کہو: اگر تم اپنے زعم میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ حق یہ ہے کہ جس نے بھی اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے، اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اس آیت میں بلٰی من اٰمن باللہ کہنے کے بجائے بلٰی من اسلم وجھہ للہ کہہ کر دراصل اللہ تعالیٰ نے ایمان کی حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ وہ صرف زبان سے اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خلوص دل سے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری بھی ضروری ہے۔

اسلام نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح نجات اُخروی کا مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اسی طرح دنیا میں بھی کامیابی کا انحصار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ اس دنیا میں ہر وہ قوم انجام کار

Marfat.com

خسران سے دوچار ہوگی جو ایمان اور عمل صالح کی سیدھی راہ کو چھوڑ کر کسی ٹیڑھی راہ کو اختیار کرے گی، فرمایا:۔

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۧ (العصر:)

زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ شاہد ہے) انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے، اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کرتے رہے۔

انسانی تاریخ کا ایک ایک صفحہ قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔ فی الواقع دنیا کی جس قوم نے بھی ایمان اور عمل صالح کی صراط مستقیم کو چھوڑا، اپنے افعال و اعمال کے لحاظ سے جانوروں سے بھی پست و فروتر ہوگئی۔ آیت ذیل میں اسی تاریخی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے:

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ۙ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۙ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ... (تین ۱-۵)

ہم نے انسان کو بہترین شکل و ساخت کے ساتھ پیدا کیا پھر ہم نے اسے سب سے نیچے درجہ کی طرف پھیر دیا سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

اسلام نے صرف ایمان اور عمل میں ربط و تعلق اور نوعیت تعلق ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ ایمان کے اجزائے ترکیبی یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرۃ کی حقیقت کو بھی کھول کھول کر بیان کیا تاکہ انسان شرک اور دوسرے اعمال بد کے ارتکاب سے محفوظ رہ سکے۔ ایمان باللہ میں توحید اور ایمان بالرسل میں رسولوں کی رسالت اور بشریت کے اقرار کے ساتھ آخری رسول کی اتباع کو لازم کیا ایمان بالآخرۃ میں عدل خداوندی کے تصور کو نمایاں کیا، اور عقیدۂ شفاعت کے عنوان سے جو غلط فہمیاں یہودیوں اور عیسائیوں میں پھیل گئی تھیں ان کا ہر ممکن سدباب کیا۔

اسلام نے عمل صالح کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی کو بھی واضح الفاظ میں

بیان کیا۔ اکثر اقوام نے عمل صالح کو صرف چند اعمال پرستش اور چند اخلاقی باتوں تک محدود کر دیا تھا۔ اسلام نے عمل صالح کے اس تنگ دائرے کو ختم کیا اور اس میں عبادات کے ساتھ جملہ اخلاق اور معاملات کو بھی شامل کیا اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ عبادات ہوں یا اخلاق اور معاملات، حقیقی معنوں میں ان پر اسی وقت عمل صالح کا اطلاق ہوگا جب ان کے کرنے سے ایک مومن کی غرض صرف رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ چنانچہ آنحضورؐ نے یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا: انما الاعمال بالنیات" اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے" (مسند احمد)

اس مختصر سے جملے نے واضح کر دیا کہ اسلام کے نزدیک عمل صالح کا مدار اخلاص نیت پر ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے سے مقصود اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے تو وہ عمل، عمل صالح کہلائے گا، اور اگر اس سے خوشنودی رب کے علاوہ کچھ اور مقصود ہے تو وہ عمل، عمل صالح نہیں کہلائے گا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو۔ اور روز آخرت اس کا کوئی اجر و ثواب بھی نہ ملے گا۔

کسی عمل کی صالحیت کے لیے جہاں اخلاص نیت شرط ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عمل اعتدال و توسط کے دائرے میں رہ کر انجام دیا جائے، اس میں غلو اور تشدد کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہ ہو۔

گزشتہ صفحات میں ایمان اور عمل صالح سے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اگلے صفحات میں اسی کی شرح و تفصیل ہے۔

Marfat.com

ایمان

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ○ (مائدہ)

جس نے ایمان لانے سے انکار کیا تو اس کا ہر عمل ضائع گیا، اور وہ روز آخرت خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔

٢٠١٥٤

ایمان

ایمان کے شرعی مفہوم، اس کے اجزائے ترکیبی، اس کے تقاضوں اور دیگر متعلقہ امور پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لغوی اور قرآنی معانی پر تفصیلی نظر ڈال لی جائے۔

ایمان کے لغوی معنی

ایمان کے لغوی معنی تصدیق کرنے، اعتماد کرنے اور اطاعت و انقیاد کے ہیں۔ لفظ ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:۔

"لغت میں ایمان کے معنی تصدیق کرنے کے ہیں، یعنی خبر دینے والے کے حکم کا یقین کرنا اس طرح کہ حکم قبول کیا جائے اور بتانے والے کو سچا قرار دیا جائے۔ یہ مصدر ہے افعال کے وزن پر۔ یہ امنٌ سے ماخوذ ہے۔ گویا ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے اس کو تکذیب و مخالفت سے امن دے دیا جائے۔ اس کا تعدیہ کبھی بذریعہ لام ہوتا ہے اور کبھی بذریعہ با۔ پہلی صورت میں اذعان یعنی یقین محکم کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں، اور دوسری صورت میں اعتراف یعنی تسلیم و انقیاد کے۔ جس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بغیر اعتراف کے تصدیق لائق اعتبار نہیں۔ کبھی حقیقت عرفیہ کے اعتبار سے اور کبھی بطور مجاز وثوق کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وثوق کرنے والا امن میں ہو گیا۔"[1]

---

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۱۱۱ ادارۃ الطباعۃ المصطفائیہ۔ دیوبند)

Marfat.com

حافظ ابن کثیر لفظ ایمان کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لغت میں لفظ ایمان کا اطلاق تصدیق محض پر ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اس کا استعمال اس مفہوم میں ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ..... (توبہ: ۶۱) "(رسول) اللہ کی تصدیق کرتا ہے اور اہل ایمان کی باتوں کی بھی تصدیق کرتا ہے۔" یا جیسا کہ برادران یوسف نے اپنے باپ سے کہا: وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لنا ولو کنا صدقین (یوسف: ۱۷) "آپ ہماری باتوں کی تصدیق نہیں کریں گے اگرچہ ہم سچے ہی ہوں۔" اسی طرح اگر ایمان اور اعمال صالحہ کا ذکر یکجا آئے تو اس وقت بھی لفظ ایمان کا یہی مفہوم مراد ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .... "زمانہ گواہ ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے تصدیق کی اور نیک اعمال کیے۔" اور جب مطلق طور پر لفظ ایمان استعمال ہو تو اس وقت مطلوبہ شرعی ایمان مراد ہوتا ہے جو اعتقاد، قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔"[1]

مولانا حمید الدین فراہی ایمان کے لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان لغت میں مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ 'امنه ای اعطاه امنا (اس کو امن بخشا) قرآن مجید میں ہے وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ' (اور خوف سے ان کو امن دیا) 'امن له۔ صدقه واعتمد علیه (اس کی تصدیق کی، اس پر اعتماد کیا) 'امن به۔ ایقن به (اس کا یقین کیا) یہ ایک قدیم دینی اصطلاح بھی ہے۔ عبرانی میں ( ) 'امن کا مادہ موجود ہے جس کے معنی صدق واعتماد کے ہیں۔ اسی سے ( ) 'امین ہے جو ایک تصدیق واعتماد کا کلمہ ہے۔ پس وہ یقین جو خشیت، توکل

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۲ سورہ بقرہ "وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ"

Marfat.com

اور اذعان کے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ پایا جائے، ایمان ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے فیصلوں پر راضی ہو جائے وہ مومن ہے۔[1]

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ لفظ ایمان، لغوی حیثیت سے اپنے صلوں کے اختلاف کی بنا پر مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ جب یہ بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی امن سے رہنے یا امن دینے کے ہوتے ہیں، اور جب صلہ با کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی اقرار و تسلیم اور ایقان کے، اور صلہ لام کے ساتھ اس کے معنی تصدیق، اعتماد اور اطاعت و انقیاد کے آتے ہیں۔

ایمان کے قرآنی معنی

عربی زبان بڑی وسیع المعنی زبان ہے۔ اس میں ایک لفظ کے متعدد معنی ہوتے ہیں۔ اگر ہم کسی لفظ کے حقیقی معنی و مفہوم کو جاننا چاہیں تو عربی لغات، جاہلی خطیبوں کے خطبات اور اس کے شعراء کے دواوین کے علاوہ ہم کو قرآن مجید کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے جو عربی مبین میں نازل ہوا ہے، اور عربی زبان کے الفاظ و اسالیب کی حقیقت کے جاننے کا سب سے زیادہ صحیح اور مستند ذریعہ ہے۔ آئیے دیکھیں کہ قرآن حکیم نے لفظ ایمان کو کن کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں یہ لفظ بغیر صلہ کے آیا ہے اس کے معنی امن دینا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ	اور اس نے ان کو خوف سے امن دیا یا امن میں رکھا۔
(قریش : ۴)	

اور جہاں صلہ با کے ساتھ آیا ہے تو اس کے ایک معنی اقرار و تسلیم کے ہیں یعنی انکار کے بالمقابل تسلیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

---

[1] تفسیر سورہ العصر صفحہ ۲۷، ۲۸

Marfat.com

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ (النساء: ۱۵۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو (یعنی بعض انبیاء کو) مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ (بقرہ: ۹۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کو تسلیم کرلو، تو کہتے ہیں کہ جو ہم پر نازل کیا گیا ہے، ہم اسی کو تسلیم کرتے ہیں، اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ اس کا انکار کر جاتے ہیں۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (آل عمران: ۷۲)

اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ جو کچھ مسلمانوں پر اُترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کے وقت اس کا انکار کردو۔ اس طرح توقع ہے کہ وہ (اپنے نئے دین سے) پھر جائیں گے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵)

کیا تم کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟

صلہ "با" کے ساتھ قرآن نے لفظ ایمان کو ایقان کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے یعنی ایسا اقرار کہ اس پر اقرار کرنے والے کا قلب و دماغ پوری طرح مطمئن ہو اور اس میں ادنیٰ شک کی گنجائش نہ پائی جائے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا (الحجرات: ۱۵)

حقیقی مومن تو وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر اور پھر شک میں مبتلا نہ ہوئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ (سبا: ۲۱)

اور ابلیس کا ان لوگوں پر جو تسلط ہوا تو فقط اس لیے تاکہ ہم جان لیں (یعنی یہ واضح ہو جائے کہ) کون لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور کون ہیں جو آخرت کے متعلق شک رکھتے ہیں۔

اس آیت میں شک کو ایمان کے بالمقابل استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے

Marfat.com

معنی دراصل یقین کے ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ۝ (توبہ: ۴۵)

تم سے اجازت وہی لوگ چاہتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے قلوب ریب و شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک ہی میں سرگرداں ہیں۔

اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے حقیقی معنی یقین کامل کے ہیں۔ اگر کسی کے قلب میں شک ہے، اور دماغ، تردد کا شکار ہے تو وہ مومن نہیں ہے کیونکہ ریب و تردد ایمان کی ضد ہیں۔

قرآن میں جہاں ایمان کا لفظ بصورت فعل آیا ہے اور اس کے بعد متعلقات ایمان کا ذکر کیا گیا ہے وہاں بالعموم ایمان کے معنی ایقان ہی کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ (البقرہ: ۴)

اور وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتری ہے، اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری تھی (یعنی کتاب الٰہی) اور جو آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ (نمل: ۲-۳)

ہدایت اور خوش خبری ہے ان مومنین کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں "وبالاخرۃ ھم یومنون" کی جگہ "وبالاخرۃ ھم یوقنون" استعمال کیا گیا ہے حالانکہ اس سے پہلے دوسرے متعلقات ایمان کے لیے "یومنون" ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لفظ کی اس تبدیلی کو اتفاقی بات نہ سمجھا جائے۔ قرآن خدا کا کلام ہے،

Marfat.com

اس کا ہر لفظ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے۔ دراصل ایک جگہ "یومنون" اور دوسری جگہ "یوقنون" کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے یومنون کی تشریح کر دی ہے کہ اس سے مراد ایقان ہے یعنی دل سے یقین رکھنا۔

اس تشریح سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بس دل سے یقین کر لینے ہی کا نام ایمان ہے۔ اس پر مفصل گفتگو آگے آئے گی، یہاں تو صرف اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ ایمان کا لفظ قرآن میں جہاں کہیں صلہ "با" کے ساتھ استعمال ہوا ہے بالخصوص متعلقات ایمان کے ذکر سے پہلے، وہاں اس کے معنی یقین کے بھی ہیں۔

صلہ "لام" کے ساتھ قرآن میں اس لفظ کا جہاں استعمال ہوا ہے وہاں اس کے ایک معنی تو بات مان لینے اور اطاعت و انقیاد کے ہیں، مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ (شعراء: ۱۱۱)

انھوں نے کہا کہ اے نوح کیا ہم تیری بات مان لیں جبکہ تمہاری پیروی کم تر درجہ کے لوگ کر رہے ہیں۔

دوسرے معنی تصدیق کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (بقرہ: ۵۵)

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری تصدیق اسی وقت کریں گے یعنی تمہیں سچا اسی وقت سمجھیں گے جب ہم اللہ کو (تم سے ہم کلام ہوتے) برملا دیکھ لیں گے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (توبہ: ۹۴)

اے پیغمبر ان سے کہہ دو: تم معذرتیں نہ پیش کرو۔ ہم تمہاری معذرتوں کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے ہم کو اللہ نے تمہارے احوال واقعی سے باخبر کر دیا ہے۔

صلہ "لام" کے ساتھ ایمان کے تیسرے معنی اعتماد کرنے کے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۭ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (توبہ: ۶۱)

وہ کہتے ہیں کہ وہ (رسول) کان کا کچا ہے کہہ دو کہ اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔ وہ خدا پر یقین

Marfat.com

رکھتا ہے اور مومنوں پر اعتماد کرتا ہے، اور تم میں جو واقعی صاحب ایمان ہیں ان کے لیے تو وہ سراپا رحمت ہے۔

ایمان کا شرعی مفہوم

ہر زبان میں یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی لفظ مصطلحات کے زمرہ میں آجاتا ہے تو اس کے لغوی معنی بالعموم تبدیل ہوجاتے ہیں اور وہ ایک متعین معنی کے لیے خاص ہوجاتا ہے۔ اس قاعدہ سے عربی زبان بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو لیجیے۔ یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ ان کے لغوی معنی بالترتیب دعا اور پاکیزگی کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح بن جانے کے بعد یہ الفاظ اپنے محدود لغوی مفہوم سے نکل کر ایک دوسرے وسیع مفہوم کے لیے خاص ہوگئے ہیں۔ چنانچہ اب ہم صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے الفاظ بول کر اُن سے صرف دعا اور پاکیزگی مراد نہیں لیتے، بلکہ عبادات کی ایک مخصوص شکل وصورت مراد لیتے ہیں جس میں لغوی مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایمان کا لفظ بول کر اب ہم لغوی مفہوم سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں یعنی اس کا اطلاق چند ایسی باتوں پر ہوتا ہے جنھیں ہم عقائد یا ایمانیات کہتے ہیں۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے چند عقائد کو تسلیم کرلیا یا اس نے چند ایسے بنیادی اُمور کو قلب کے پورے یقین کے ساتھ تسلیم کرلیا جن کو تسلیم کیے بغیر وہ مومن نہیں ہوسکتا۔ اسی کا نام شریعت میں ایمان ہے جسے اصطلاح میں تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

شریعت کی رُو سے جو شخص بھی دل سے خدا اور اس کے رسول پر اور اس کی آیات پر یقین رکھتا ہے، اور ان تمام احکامات وہدایات کو برحق سمجھتا ہے جن کے بارے میں اسے بالتصریح معلوم ہے کہ یہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ہیں، اور وہ زبان سے بھی ان کا معترف ہو اور اس کے اعمال بھی اس کے اس یقین قلب اور اعتراف زبان سے حتی الوسع مطابقت رکھتے ہوں، وہ مومن ہے۔ صرف اسی صورت میں وہ دائرہ ایمان سے خارج سمجھا جائے گا جب وہ اپنے قول یا فعل سے ان چیزوں کا انکار کردے جن کو وہ پہلے صحیح اور برحق تسلیم کرچکا ہے۔

Marfat.com

تکمیل ایمان کے شرائط

ہم نے اُوپر کی سطروں میں ایمان کی جن تین شرطوں یعنی تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور اثبات بالعمل کا ذکر کیا ہے، وہ تینوں شرطیں تکمیل ایمان کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان میں سے کوئی شرط بھی عام حالات میں ساقط نہیں ہوسکتی ہے۔

ایمان کی یہ شرطیں بالکل اسی طرح کی ہیں جیسے دنیا کی تمام نظریاتی تحریکات میں شمولیت کے لیے کچھ شرائط وضوابط کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص اشتراکی تحریک کا، جو ایک نظریاتی تحریک ہے، رکن (Member) صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب وہ اس جماعت کے تمام اقتصادی وسماجی نظریات پر دل سے یقین رکھے، زبان سے ان کا اقرار کرے، اور بقدر استطاعت ان نظریات کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی ان نظریات کے مطابق سماج میں تغیر و انقلاب لانے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرے۔ سیاسی اصطلاح میں ایسے ہی اشخاص کو مستعد کارکن (Active worker) کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اس بلند معیار پر پورے نہیں اُترتے وہ جماعت کے رکن نہیں سمجھے جاتے۔ رکن وہ لوگ بھی سمجھے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر جماعت کے نظریات کے وفادار ہوتے ہیں، اور اس کے ہر حکم وہدایت پر مقدور بھر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے شخص کو جماعت کا رکن نہیں سمجھا جاسکتا جو نہ تو جماعت کے نظریات پر یقین رکھتا ہو، اور نہ اس کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی جدوجہد کرتا ہو، بلکہ ایسے کام کرتا ہو جو سراسر جماعت کے نظریے اور پالیسی کے خلاف ہوں حتیٰ کہ اسے جو حکم وہدایت بھی جماعت کی طرف سے دی جائے اس کو نظرانداز کردے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو کوئی بھی نظریاتی جماعت اپنا رکن تسلیم نہیں کرسکتی۔ وہ پہلی فرصت میں اس کو منحرف قرار دے کر جماعت سے نکال دے گی۔ اس صورت میں کوئی احمق ہی ہوگا جو کہے گا کہ اس کو جماعت سے نکال کر جماعت نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے۔

کسی بھی جماعت کے مختلف اراکین میں جماعت کے نظریات اور پروگراموں پر یقین

Marfat.com

اور اس کے مطابق عمل میں فرق مراتب تو ہو سکتا ہے، کیونکہ ہر شخص نہ یکساں ذہنی استعداد رکھتا ہے اور نہ یکساں قوت عمل ہی کا مالک ہوتا ہے، لیکن سرے سے یقین و عمل ہی کا فقدان ہو ایسا ناممکن ہے، اور اگر کسی رکن کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے تو وہ یقیناً اس جماعت کا رکن بننے کا اہل نہیں ہے۔

معاملے کی یہی صورت ایمان اور جماعت مومنین کے ساتھ بھی ہے۔ اگر کوئی شخص جماعت مومنین کا رکن بننا چاہتا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ جماعت کے نظریات (عقائد) پر دل سے یقین رکھے، زبان سے اُن کا اقرار کرے، اور اپنے عمل سے اخلاص ایمان کا ثبوت دے یعنی جماعت کے اصول و نظریات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو بلاشبہ وہ جماعت مومنین کا رکن سمجھا جائے گا، اور اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو وہ جماعت کا رکن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو اس کا رکن ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کرے۔

اس جماعت میں بھی جماعت کے بنیادی عقائد اور اس کے احکام اور دستور العمل پر یقین واعتماد کے اعتبار سے حیثیات و مراتب کا فرق تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن جو شخص سرے سے اس جماعت کے عقائد اور اصول وضوابط پر یقین ہی نہ رکھتا ہو، اور زندگی کے ہر معاملے میں جماعت کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتا ہو، وہ جماعت مومنین سے خارج سمجھا جائے گا خواہ اس کا نام اور حسب نسب کچھ بھی ہو۔

نظریاتی جماعتوں سے وابستگی کی بنیاد یقین و عمل پر ہے نہ کہ حسب نسب پر۔ دین اسلام ایک نظریاتی تحریک کا نام ہے اس لیے اس سے وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول و نظریات پر دل سے یقین رکھا جائے، زبان سے اس کی صداقت کا اعتراف کیا جائے، اور اس صداقت کو خود اپنی زندگی میں اور معاشرے میں نافذ اور غالب کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔

تکمیل ایمان کے ان تینوں شرائط کی ہم مزید وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے تمام اطراف وجوانب واضح ہو جائیں، اور کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

۱۔ تصدیق بالقلب

یہ تکمیل ایمان کی اولین اور بنیادی شرط ہے، یعنی قلب کا اذعان ویقین جو شخص بھی ایمان سے

مشرف ہونا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورے صمیم قلب سے متعلقات ایمان پر یقین واعتماد رکھے۔ اس یقین واعتماد کے بعد ہی وہ حقیقی مومن سمجھا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا.....

(الحجرات: ۱۵)

حقیقی مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اس یقین قلب کے متعلق فرماتے ہیں:

"عربی میں ایمان کے معنی زوال شک کے ہیں یعنی کامل درجے کا بھروسہ، کامل درجے کا اقرار تمہارے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ اللہ کی صداقت پر، اللہ کے اصولوں پر جس وقت تک کامل درجے کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے تو تمہیں اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے، تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی، اس کی سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان یعنی یقین، جماؤ، تسکین اور اقرار پیدا ہو۔"[1]

یقین علم کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ آگ جلاتی ہے اس پر ہمارا یقین تمام تر ہمارے علم و تجربہ کا نتیجہ ہے۔ اور اسی یقین کی وجہ سے ہم ہوش وحواس کے عالم میں کبھی آگ میں اپنی انگلی نہیں ڈالتے، لیکن ایک کم سن بچہ بے خوف وخطر آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ آگ جلاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر علم نہیں ہے تو قلب ودماغ میں یقین واعتماد پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور ایمان قلب ودماغ کے یقین واعتماد ہی کا نام ہے۔ اس لیے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن چیزوں پر ایمان رکھتا ہے ان کے متعلق بقدر استعداد علم بھی حاصل کرے، اور غور وفکر بھی کرتا رہے تاکہ ایمان میں پختگی پیدا ہو اور قلب ودماغ حلاوتِ ایمان سے صحیح طور پر آشنا ہو سکیں وہ علم جو ایک مومن کے قلب ودماغ کو طمانیت اور یقین واعتماد کی روشنی عطا کر سکتا ہے، انفس وآفاق کا مشاہدہ ہے۔ ایک مومن جوں جوں

[1] مولانا آزاد کی تقریریں صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹

Marfat.com

انفس وآفاق کی وادی میں غور و فکر کے قدم بڑھاتا ہے اس پر حقیقت حال منکشف ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اصل حقیقت کو پالیتا ہے، اور اس کا قلب و دماغ یقین و اطمینان کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

(آل عمران: ۱۹۱)

بیشک زمین اور آسمانوں کی تخلیق اور گردشِ لیل و نہار میں نشانیاں ہیں ان عقل مندوں کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں (غور و فکر کے نتیجے میں وہ حقیقت حال سے باخبر ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ (کائنات) فضول نہیں بنائی ہے۔ کار فضول سے تیری ذات پاک ہے۔ تو ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا ایک مومن کے یقین قلب اور عرفان حقیقت کا مظہر ہے۔ یہ ملکوتِ ارض و سما کا مشاہدہ ہی تو تھا جس نے ابراہیم علیہ السلام کے آئینہ قلب کو مجلّٰی اور ان کے سینے کو یقین و اعتماد کے انوار سے بھر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ۝ (انعام: ۷۵)

اور یوں طور ہم نے ابراہیم کو زمین اور آسمانوں کے نظم و اقتدار کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ یقین و اعتماد کا حامل بن جائے۔

قرآن میں جگہ جگہ جو تخلیقِ ارض و سما پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ انسان کو معرفت کردگار اس طرح حاصل ہو کہ اس کا قلب و دماغ یقین و اعتماد سے لبریز ہو جائے، بالفاظ دیگر خالق کائنات یہ بتانا چاہتا ہے کہ علم کے راستے ہی سے ایک انسان بقدر ظرف اس کا

عرفان حاصل کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ علم ہی ہمارے یقین قلب و دماغ کا ذریعہ ہے، بالکل مشاہداتی حقیقت ہے۔ آپ کسی پیدائشی اندھے اور بہرے آدمی کے سامنے خالقِ ارض و سما کی عظمت و کبریائی اور اس کے حسن تخلیق کا لاکھ قصیدہ پڑھیں، وہ خدا کی عظمت و رفعت اور اس کی تخلیق کی ندرت کاریوں سے بالکل بے خبر ہوگا، کیونکہ علم کے دو بڑے ذریعے یعنی بصارت و سماعت اس کے پاس موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حواس تو صحیح حالت میں ہوتے ہیں لیکن انسان دنائتِ نفس اور جہل و بے ابصری کے سبب اُن سے صحیح طور پر کام نہیں لیتا مثلاً وہ آنکھ رکھتے ہوئے آثار و مظاہر کائنات پر غور و فکر نہ کرے، اور اُن سے اس طرح صرف نظر کر جائے جیسے اندھا، اسی طرح قوت سماعت تو رکھتا ہو لیکن رب کائنات کے ارشادات اور اس کے انبیاء و رسل کے فرمودات کو سن کر اس طرح بے خبر بن جائے جیسے بہرا، اسی طرح قلب تو رکھتا ہو لیکن اس جہان فانی کے کسی حادثے اور کسی واقعے سے بھی وہ ذرہ برابر منفعل نہ ہوتا ہو جیسے کوئی سنگ دل انسان۔ ایسے شخص کو قرآن جانور سے بھی بدتر قرار دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے اور خواہشات نفس ہی کو اپنا معبود بنا کر اسی کی پرستش میں شب و روز مشغول رہتا ہے، ایک جگہ فرمایا:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ۝ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ (الفرقان: ۴۴)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا لیا ہے؟ کیا تم اس پر نگہبان ہو؟ یا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ تو صرف جانور ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ (حقیقت حال سے) بے خبر اور گم گشتہ راہ ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓىٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (اعراف: ۱۷۹)

Marfat.com

ان کے دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں لیکن سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ کھوئے ہوئے یہ وہ لوگ ہیں جو سرتاسر غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خدا کی بخشی ہوئی عقل اور دوسرے ذرائع علم سے کام نہیں لیتا ہے اس کے قلب کو صحیح معنوں میں ایمان یعنی قلب کا نور کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ فی الواقع ایمان کا پہلا مرحلہ جو یقین قلب سے عبارت ہے، وہی شخص بحسن و خوبی طے کر سکتا ہے جو علم و نظر کی قوتوں سے بہرہ مند ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایمان صرف علم و یقین ہی کا نام ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ابلیس بھی مومن ہوتا کہ اسے بھی معرفت رب حاصل تھی۔ فرعون بھی صاحب یقین تھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام خدا کے فرستادہ رسول ہیں، اور وہ جو نشانیاں اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں وہ برحق ہیں، لیکن اس علم و یقین کے باوجود وہ مومن نہ تھا۔ اس کے علم و یقین کے متعلق خود قرآن مجید میں آیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (نمل-۱۳،۱۴)

جب ہماری نشانیاں اُن کے سامنے آگئیں تو انھوں نے کہا "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے" وہ ظلم اور بڑائی کے گھمنڈ میں آیات کا انکار کر رہے تھے۔ حالانکہ ان کے نفوس نے (ان نشانیوں کے من جانب اللہ ہونے کا) یقین کر لیا تھا۔

فرعون کے سلسلے میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی قرآن مجید میں موجود ہے:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝

تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں زمین اور آسمانوں کے رب کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں۔ اور اے فرعون میں تم کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

اس علم و یقین کے باوجود وہ مومن کیوں نہیں تھا؟ صرف اس لیے کہ اس کے نفس

Marfat.com

نے اقرار نہ کیا اور زبان تصدیق سے گریزاں رہی۔ اصل بات یہ ہے کہ جب نفس بے لگام ہو جاتا ہے اور آدمی کے قلب و دماغ میں سرکشی اور نخوت و انکبار سرایت کر جاتا ہے تو وہ علم و یقین کے باوجود صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، کیوں کہ صداقت کو تسلیم کر لینے کے بعد نفس کی بے عنانی اور تمرد و سرکشی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تصدیق کے بجائے تکذیب کی جو عمارت اس نے کھڑی کر رکھی ہے اس کے گر جانے کے بعد چونکہ خود اس کی اپنی ذات اور ساکھ کے گر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے علم و یقین کے باوجود وہ تکذیب کی روش نہیں چھوڑتا اور جھوٹی عزت و وقار کی خاطر وہ صداقت کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔

بعض اوقات آدمی علم و معرفت کے باوجود صرف بغض و حسد کی وجہ سے صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ بنی اسرائیل اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے فرستادہ اور اس کے آخری نبی اور رسول ہیں، لیکن اس کے باوجود صرف قومی افتخار اور نسلی غرور کی وجہ سے وہ آپ کی رسالت کے منکر بن گئے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔

(البقرہ : ۸۹)

پس جب وہ اُن کے پاس آگیا جس کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے تو اس کے منکر بن گئے۔ منکرین حق پر خدا کی پھٹکار ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجرد علم و یقین ایمان کے لیے کافی نہیں ہے۔ علم و یقین کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ جس بات کا اسے علم و یقین ہو چکا ہے دل سے اس کی صداقت تسلیم کرے۔

۲۔ اقرار باللسان

یہ تکمیل ایمان کی دوسری شرط ہے یعنی جس چیز کا یقین قلب کو حاصل ہو چکا ہے اس کا اقرار و اعتراف زبان سے بھی کیا جائے۔ زبان سے اقرار و اعتراف دراصل تصدیق قلب کی شہادت ہے اور اس بات کی علامت کہ مقر کے جذبات اور ارادوں نے بھی اطاعت قبول کر لی ہے، اور یہی ایمان کی اصل ہے۔ قرآن کی درج ذیل آیات، علم و معرفت اور شہادت قلب کی ایک نہایت عمدہ مثال ہیں۔

Marfat.com

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ
مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝
وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا
رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(مائدہ : ۸۵)

جب انھوں نے اس کلام کو جو رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے، سنا تو تم نے دیکھا کہ معرفت حق کے نتیجے میں ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور وہ کہہ اٹھے "اے ہمارے رب ہم ایمان لائے، ہمارا نام حق کے گواہوں میں لکھ لیجیے۔ جب حق ہمارے پاس آگیا تو پھر ہم اس پر ایمان کیوں نہ لائیں؟ یہ ہماری دلی آرزو ہے کہ ہمارا رب ہم کو صلحاء کے زمرہ میں داخل فرمائے۔" اللہ نے ان کے اس قول (شہادت) کے سبب ان کو جنّت عطا کی جس میں نہریں رواں ہیں، اور جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ نیک عمل کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ معرفت حق کا اثر کس طرح اشکوں کی روانی کی صورت میں اظاہر ہوا۔ اِدھر قلب، جذبۂ حق شناسی سے پرجوش ہوا اور اُدھر زبان پر یہ کلمہ بے اختیار جاری ہو گیا۔ "رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ"

اس سے معلوم ہوا کہ قول جذبات دل کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص دل میں اللہ، اس کے رسول اور اس کی آیات کا علم ویقین تو رکھتا ہے لیکن زبان سے اس کا اقرار نہیں کرتا تو ایسا شخص اہل ایمان کی نگاہ میں مومن نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ ایمان کا محل قلب ہے اور جب تک آدمی اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرے کوئی شخص اس کے درون دل کا حال نہیں جان سکتا۔ علم ویقین کے بعد زبان سے اقرار وتسلیم لازمۂ ایمان ہے اور باستثنائے چند اس سے کسی صورت سے بھی مفر ممکن نہیں ہے۔ استثنائی صورت خوفِ جان کی ہے۔ اگر اظہار ایمان سے کسی شخص کو اپنی جان کا خوف ہو تو شریعت اس کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے ایمان کو مخفی رکھے، اور ایسے شخص کو قرآن نے مومن قرار

دیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے :

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (فتح : ۲۵)

اگر ایسے مومن مرد اور مومنہ عورتیں جن سے تم واقف نہ تھے (مکہ میں) موجود نہ ہوتے، جن کو (لڑائی کی صورت میں) تم پامال کر ڈالتے، پس ان کے باعث تم پر الزام آتا لاعلمی کے سبب (تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے، لیکن خدا نے صلح کے ذریعہ اس مصلحت سے لڑائی نہ ہونے دی کہ) خدا (اس عرصہ میں) جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کرلے۔

اس آیت میں ان لوگوں کو بھی مومن قرار دیا گیا ہے جن کے ایمان کا حال کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف جان کی صورت میں اگر کوئی شخص اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرتا تو وہ عنداللہ مومن سمجھا جائے گا خواہ بندوں کے نزدیک مومن نہ ہو کہ بندہ اظہار لسانی کے بعد ہی کسی کے ایمان کے متعلق کچھ جان سکتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تاریخی پس منظر سامنے ہو تو اخفائے ایمان کی حقیقت کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کا معاملہ اس وقت پیش آیا تھا جب مسلمان آنحضورؐ کے ہمراہ ۶ھ میں عمرہ کی غرض سے مکہ گئے تھے لیکن کفار مکہ نے قومی حمیت کے جوش میں آکر مسلمانوں کو مکہ کے اندر داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ شہادت عثمان کی خبر اور بعض دوسرے محرکات کے سبب قریب تھا کہ مسلمانوں اور کافروں میں آتش جنگ بھڑک اُٹھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے اس جنگ کو روک دیا۔ جنگ روکنے میں اللہ کی مصلحت یہ تھی کہ مکہ کے اندر ابھی ایسے لوگوں کی قابل ذکر تعداد موجود تھی جو اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن کفار مکہ کے جور و ستم اور خوف جان و مال کے سبب اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے، اس میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے۔ لڑائی کی صورت میں عین ممکن تھا کہ یہ صاحب ایمان افراد بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے، اور انھیں اس سے ندامت ہوتی اور تکلیف پہونچتی اس لیے اللہ تعالیٰ نے جنگ روک دی تاکہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ کشت و خون سے محفوظ رہیں، اس میں ایک حکمت اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ جو ابھی ایمان نہیں لائے ہیں ان کو بھی سعادت ایمانی سے بہرہ مند ہونے کا مزید موقع مل جائے۔ اسی بات

Marfat.com

کو آیت مذکورہ میں "دخول فی رحمۃ اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اخفائے ایمان کی ایک دوسری مثال سورہ مومن کے اندر موجود ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ (المومن: ۲۸)

آل فرعون سے تعلق رکھنے والے ایک مرد مومن نے جو اپنا ایمان مخفی رکھے ہوئے تھا کہا: کیا تم ایک آدمی کو محض اس بنا پر قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ خدا ہی کو اپنا رب قرار دیتا ہے، اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل بھی لایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر قوم فرعون کا بھی ایک شخص ایمان لایا تھا۔ لیکن فرعون کے ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اس کے باوجود جب اس نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ضروری سمجھا تو اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ دعوت حق کی حمایت میں اس نے اپنی قوم کے سامنے جو پراثر تقریر کی وہ قرآن مجید میں اسی سورہ کے اندر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تقریر پند و موعظت اور دانش و بصیرت کا بے نظیر نمونہ ہے۔ تقریر کا ایک ایک لفظ اس کے ایمان کی شہادت دیتا ہے۔ اس تقریر کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو کس قدر درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۚ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۔ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۔ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۔ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۔ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۔ (المومن: ۳۸ تا ۴۴)

Marfat.com

وہ شخص جو ایمان لایا تھا بولا "اے میری قوم! میری بات مانو، میں تمہیں ہدایت وسعادت کی راہ بتاتا ہوں۔ اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی صرف متاعِ چند روزہ ہے اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ (یاد رکھو) جس نے برائی کی ہے اس کو برائی کے بقدر بدلہ ملے گا، اور جس نے اچھا عمل کیا ہے خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں انھیں بے حساب روزی ملے گی۔ اے میری قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہو۔ تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کردوں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤں جن کا مجھے علم نہیں، اور میں تمہیں اس ہستی کی طرف بلاتا ہوں جو نہایت ہی زبردست اور معاف کرنے والی ہے۔ بلاشبہ تم مجھے جس چیز کی طرف بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا میں پکارے جانے کے قابل ہے اور نہ ہی آخرت میں، اور بلاشبہ ہم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں وہ دوزخ میں جائیں گے۔ میں آج جو کچھ تم سے کہتا ہوں عنقریب تم اسے یاد کرو گے (کہ میں اپنے قول میں کتنا سچا تھا) اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اللہ ہی اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔

جس استثنائی صورت کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی خوف جان، اس کے سوا ہر حال میں ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ تصدیق قلب کے ساتھ زبان سے بھی ایمان کا اقرار و اعتراف کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ علم ویقین کے باوجود مومن نہیں ہو سکتا۔ ایسا علم و یقین خود صاحب یقین کے خلاف حجت ہے۔

۳۔ اثبات بالعمل

یہ تکمیل ایمان کی تیسری شرط ہے یعنی یقین قلب اور اقرار لسان کے ساتھ مومن اپنے عمل سے بھی ایمان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک آدمی کے قلب میں تصدیق موجود نہ ہو لیکن وہ زبان سے تصدیق ایمان کر رہا ہو۔ چونکہ قول جھوٹ ہو سکتا ہے اس لیے تکمیلِ ایمان کے لیے اس تیسری شرط کی تکمیل ناگزیر ہے۔ اس کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی

Marfat.com

واقعی مومن ہے، کیونکہ اعمال کا تعلق انسان کے قلب سے ہوتا ہے جو جذبات اور ارادوں کا مصدر و منبع ہے۔ گویا اعمال کے آئینہ میں قلب کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے کہ اس میں فی الواقع تصدیق موجود ہے یا نہیں۔ اگر صرف زبان سے اقرار ایمان کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(البقرہ: ۸-۹)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو (زبان سے) اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں وہ (زبان سے اقرار ایمان کر کے) اللہ اور مومنوں کو فریب دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود مبتلائے فریب ہیں اور اس کو سمجھتے نہیں۔

قرآن مجید کی یہ آیت سورہ بقرہ کی بالکل ابتدائی آیات میں ہے اور اس میں جس گروہ کو ایمان کے زبانی اقرار کے باوجود مومن نہیں کہا گیا ہے وہ یہودیوں کا ایک گروہ تھا۔ ان کے ایمان کی نفی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ آخری نبی کی رسالت کے منکر تھے، اور دوسری وجہ اقرار ایمان کے باوجود ان کی سرکشی و نافرمانی تھی۔ اللہ نے ان کو خبردار کیا کہ تم صرف زبان سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے سے مومن نہیں سمجھ لیے جاؤ گے جب تک کہ ان کے تقاضوں پر صدق دل کے ساتھ عمل نہیں کرتے۔ آگے کی آیات میں ان کے تمام جرائم کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا ہے یعنی فساد فی الارض:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ: ۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ (ہماری دوڑ دھوپ کا مقصد فتنہ و فساد نہیں) ہم تو اصلاح چاہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی اصل مفسد و بدکار ہیں مگر (جہالت و نفس پرستی کی وجہ سے اپنی مفسدانہ حرکات کو فتنہ و فساد) نہیں سمجھتے۔

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ بھی صرف زبان سے اقرار ایمان کو کافی قرار نہیں دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ

مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (سورہ نور: ۴۷)

اور (دیکھو) یہ لوگ کہتے ہیں: ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کی اطاعت کی۔ پھر اس اقرار کے بعد انہی میں ایک فریق ہے جو (اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل سے) روگردانی کرتا ہے۔ فی الحقیقت ایسے لوگ سرے سے مومن ہی نہیں ہیں۔

اس آیت میں زبان سے اقرار ایمان اور اظہار اطاعت کے باوجود کچھ لوگوں کو مومن تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ انھوں نے اقرار ایمان کے بعد اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل سے روگردانی کی۔

قرآن میں ایک اور جگہ ایسے لوگوں کو مومن قرار نہیں دیا گیا ہے جو زبان سے کہتے تھے کہ وہ مومن ہیں، اور یہ لوگ عرب کے بدو تھے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(حجرات: ۱۴)

بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے (سیاسی) اطاعت قبول کر لی ہے" اور ابھی تک ایمان تمہارے قلب میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم (واقعی دل سے) اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو تو وہ تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہ کرے گا۔ بیشک اللہ درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایمان کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ انسان کے قلب سے ہے یعنی آدمی صرف زبان سے اقرار و تسلیم کی بات نہ کرے بلکہ دل سے اقرار و اعتراف کرے اور عمل سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے۔ اللہ نے بدوؤں کو بتایا کہ تم زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتے ہو، اور تم نے ظاہر میں اطاعت بھی قبول کر لی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے سے جی چراتے ہو، اور اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ اور اس کے رسول کے حکموں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہو، یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا ایمان سچا نہیں ہے۔ تم نے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو نہیں مانا ہے بلکہ صرف حالات کے دباؤ کی وجہ سے سیاسی اطاعت قبول کر لی ہے، اور

Marfat.com

مومنوں کے زمرہ میں شامل ہو کر صرف دنیاوی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہو۔

قلب میں دخولِ ایمان سے قرآن مجید کی مراد خلوصِ دل اور جذبۂ نیک نیتی کے ساتھ ایمان لانا ہے نہ کہ صرف دکھاوے کے لیے زبان سے اظہارِ ایمان کرنا۔ اگر یہ دل سے ایمان لائے ہوتے تو پھر اُن کی خواہشات اور ارادے جن کا منبع قلب ہے، اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے تابع ہو جاتے، اور وہ اپنے ہر عمل میں اپنی خواہش و مرضی کے بجائے اللہ اور اس کے رسول کی خواہش و مرضی کو مقدم رکھتے۔

قرآن میں ایک اور مقام پر زبان سے اقرارِ ایمان کی نفی کی گئی ہے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ

(مائدہ : ۴۱)

اے رسول وہ لوگ جو انکارِ حق میں سرگرمی دکھا رہے ہیں، تم ان کی حرکات سے رنجیدہ مت ہو۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور ان کے دل حقیقی ایمان سے قطعاً محروم ہیں۔

اس آیت میں اُن کے ایمان کی نفی ان کے اعمال کی وجہ سے کی گئی ہے۔ اگر ان کے قلوب واقعی لذتِ ایمان سے آشنا ہوتے تو پھر ان کی روش منکرینِ حق کی روش سے قطعاً مختلف ہوتی۔ ان کی ساری سعی و طلب حق کے لیے اور صرف حق کے لیے ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کی تمام جد و جہد اور شب و روز کی مصروفیات صاف بتا رہی ہیں کہ وہ حق کے مقابلے میں کفر کے حامی ہیں۔ وہ حق کا فروغ نہیں چاہتے بلکہ کفر (نظامِ باطل) کا بول بالا چاہتے ہیں (يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ) یہ چیز سراسر ایمان کے منافی ہے۔ اگر وہ دل سے ایمان لائے ہوتے تو ان کی ساری تگ و دو اور جانفشانی اللہ کے راستے میں ہوتی اور اپنی جان اور مال سے کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے کوشاں ہوتے، کیونکہ حقیقی مومن کی یہی شانِ امتیاز ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ

Marfat.com

الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات : ۱۵)

بیشک مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر دل سے ایمان رکھتے ہیں اور ذرا بھی شک نہیں کرتے اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کے راستہ میں جدوجہد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب قلب میں ایمان داخل ہوتا ہے تو اس کا ہر عمل اس کے صدق و اخلاص کی شہادت دیتا ہے۔ عمل دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو وہ جس کا تعلق صرف خارجی اعضاء بدن سے ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جس میں اعضاء کی حرکت کے ساتھ جذبۂ دل کی حرارت بھی شامل ہوتی ہے۔ جب فعل کا صدور صرف اعضاء و جوارح سے ہوگا تو اس میں سرگرمی، جوش و ولولہ اور تسلسل نہیں ملے گا، اور اسی حالت کو ہم بے دلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب فعل کا صدور دل سے ہوگا یعنی اعضاء کی حرکت میں جذبۂ دل کی تپش اور روح کا سوز و گداز بھی شامل ہوگا تو اس میں جوش و ولولہ، گرمجوشی و مستعدی، ایثار جان و مال اور تواتر عمل کی شان ملے گی۔

اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ وہ مومن ہے تو اس کی روزمرہ کی زندگی اور اس کے معمولات و مشاغل کو دیکھ کر آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دعوائے ایمان صرف زبان سے ہے یا اس میں اخلاص اور جذبۂ دل بھی شامل ہے بشرطیکہ وہ مومن ہونے کا حقیقی مفہوم بھی جانتا ہو۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصود آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ فقط زبان سے یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان لائے کافی نہیں ہے۔ آپ کا ایمان اُسی وقت معتبر سمجھا جائے گا جب قول کے ساتھ آپ کا فعل بھی ایمان کی شہادت دے۔ اگر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ سنکھیا مہلک شئے ہے تو لازماً اس کا عمل بھی اس کے قول کے مطابق ہوگا یعنی وہ کبھی بقید ہوش و حواس سنکھیا کو حلق کے نیچے نہیں لے جائے گا؛ اسی طرح جو شخص اپنی زبان سے خدا کو اپنا خالق و مالک تسلیم کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کی حکم عدولی کے نتائج ایک دن مہلک نکلیں گے، وہ کیونکر دیدہ و دانستہ خدا کی نافرمانی کر سکتا ہے؟ اور اگر نافرمانی کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جزیرہ کے عامل عدی ابن عدی کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں ایمان کی حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ فرمان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

Marfat.com

"ایمان چند عقائد، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے۔ جس شخص نے ان تمام اجزاء کی تکمیل کرلی اس نے ایمان کو مکمل کرلیا اور جو ان کی تکمیل نہ کرسکا اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ اگر میں بقید حیات رہا تو ان تمام اجزائے ایمان کو کھول کر تمہارے سامنے بیان کروں گا تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو۔ اور اگر میں اس دارفانی سے رحلت کرگیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی کوئی خواہش بھی نہیں۔" [1]

اس سے یہ بات واضح ہے کہ ایمان نہ صرف یقین قلب کا نام ہے اور نہ صرف اقرار زبان کا، بلکہ اذعان قلب اقرار زبان اور اظہار عمل تینوں سے عبارت ہے۔ بقدر استعداد ان اُمور ثلاثہ کی تکمیل کے بعد ہی ایمان کامل ہوتا ہے اور ایک شخص حقیقی مومن کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔

ایمان کے اجزائے ترکیبی

ایمان جن اجزا سے مرکب ہے ان کی تعداد پانچ ہے:

۱۔ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ رسولوں پر ایمان۔

۴۔ آسمانی کتابوں پر ایمان۔

۵۔ یوم آخرت پر ایمان۔

یہی پانچ اُمور [2] ایمان کے اجزائے ترکیبی کہلاتے ہیں اور انھیں کو ہم عقائد سے موسوم کرتے

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۲۷۳۔

[2] قرآن مجید میں انھیں پانچ امور کو ایمان کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے لیکن قرآن مجید کے بعض اشارات اور چند احادیث سے معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث عمرؓ سے بھی واضح ہے) کہ تقدیر بھی جزو ایمان ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ایمان کے ایک مستقل جزو کی حیثیت سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ ایمان بالقدر دراصل ایمان باللہ ہی کا ایک جزو ہے۔ اس پر ایمان سے مقصود اللہ کے لاانتہا علم و قدرت کو تسلیم کرنا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہیں۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے جس سے ایمان کے اجزائے ترکیبی پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"ایک دن ہم کچھ صحابہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ دفعتاً ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کا لباس غیر معمولی طور پر سفید تھا اور بال گہرے سیاہ۔ اس پر سفر کے اثرات ذرا بھی نمایاں نہیں تھے اور ہم میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا (کہ کون ہے) آتے ہی وہ بڑی بے تکلفی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور ہتھیلیاں اپنی رانوں پر رکھ لیں پھر سوال کے انداز میں بولا:

"اے محمدؐ مجھے خبر دیجئے اسلام کیا ہے؟"

حضور نے جواب دیا: "اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کا رسول ہے۔ اور یہ کہ تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کرو۔"

یہ شخص بولا "آپ نے ٹھیک کہا۔"

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی سوال کر رہا ہے اور خود ہی جواب کی تصدیق اور توثیق بھی کر رہا ہے۔

اس نے حضور سے پوچھا۔ "اچھا یہ بتائیے ایمان کیا ہے؟"

حضور نے ارشاد فرمایا "ایمان یہ ہے کہ تہ دل سے یقین رکھو اللہ کا، اس کے فرشتوں کا اس کی نازل شدہ کتابوں کا، اس کے رسولوں کا، یوم آخرت کا، اور اس بات کا کہ خیر ہو یا شر سب کچھ پہلے سے مقدر ہے۔"

اس شخص نے پہلے ہی کی طرح اس کی بھی تصدیق کی۔

حدیث کافی طویل ہے جس میں احسان اور علامات قیامت کے متعلق بھی مسائل کی

(بقیہ گذشتہ حاشیہ) نے اس مسئلہ پر اچھی بحث کی ہے۔ دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل باب الایمان بالقدر صہ۱۵۲ (مصنف)

Marfat.com

طرف سے استفسار کیا گیا ہے۔ یہ سائل حضرت جبرئیل تھے۔ اس کی خبر خود حضور نے صحابہ کو سائل کے چلے جانے کے بعد دی۔

یہی حدیث تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ بخاری اور ترمذی میں بھی روایت ہوئی ہے۔ بخاری میں اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اور ترمذی میں حضرت ابن عمرؓ لیکن انھوں نے حضرت عمرؓ کے واسطے سے ہی اسے روایت کیا ہے۔

ایمان کے اجزائے ترکیبی کا ذکر قرآن مجید میں بھی موجود ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ (بقرہ: ۲۸۵)

جو کچھ اللہ کی طرف سے اس کے رسول کے پاس بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان رکھتا ہے اور مومنین بھی سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم رسولوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ

نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ تمہارا رخ مشرق کی طرف ہو یا مغرب کی طرف بلکہ اللہ، یوم آخرت فرشتوں، کتابوں، اور نبیوں پر ایمان رکھنا ہی اصل نیکی ہے۔

حدیث عمرؓ اور قرآن مجید کی مذکورہ آیتوں سے آپ نے اچھی طرح جان لیا ہوگا کہ ایمان کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؛ انھیں اجزا پر دل سے ایمان رکھنے، اور زبان سے ان کا اقرار کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام شریعت میں ایمان ہے۔ جس نے ایمان کے ان بنیادی امور کو یقین قلب کے ساتھ تسلیم کر لیا اور ان کے مقتضیات پر عمل پیرا ہو گیا وہ مومن ہے۔

اجزائے ایمان کی مختصر تشریح

ایمان کے لغوی اور شرعی مفہوم کی وضاحت نیز اجزائے ایمان کے ذکر کے بعد اب ہم

Marfat.com

اجزائے ایمان کی مختصر تشریح کریں گے تاکہ آپ کا ذہن و قلب ایمان کی اصل حقیقت سے آشنا ہوسکے کیونکہ ان کی حیثیت اساس دین کی ہے۔ان کی اصل حقیقت کو سمجھے بغیر نہ تو آپ کا ایمان مکمل ہوگا اور نہ آپ فکر و عمل کی لغزشوں سے محفوظ ہی رہ سکیں گے۔ صحیح فکر اور حسن عمل کا تمام تر انحصار ایمان کے صحیح تصور پر ہے۔ آج مسلمانوں اور دیگر اقوام عالم کی تمام فکری اور عملی گمراہیوں کی واحد وجہ حقیقت ایمان کی غلط تعبیر ہے۔

سب سے پہلے ہم ایمان باللہ کی حقیقت پر روشنی ڈالیں گے۔

ایمان باللہ

خدا پر ایمان لانے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ خود خدا کی ہستی کیا ہے؟ یہ سوال میں نے اس لیے قائم کیا ہے کہ ایک ناخواندہ شخص تو بلاشبہ خدا کے متعلق کچھ جانے بغیر اس پر ایمان رکھتا ہے، لیکن دور جدید کا تعلیم یافتہ انسان خدا پر ایمان لانے سے پہلے یہ ضرور جاننا چاہتا ہے کہ وہ ہستی کیا ہے جس پر ایمان لانا اس کے لیے ناگزیر ہے؟

تصوّر ذات

اللہ جس ہستی کا نام ہے وہ فی الواقع انسانی عقل و حواس کے لیے بالکل ناقابل ادراک ہے اب تک کی تمام عقلی و فکری کاوشیں اسی بات کا ثبوت ہیں کہ اس ہستی کا ادراک انسانی عقل و حواس کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ سینٹ وکٹر کی خانقاہ کا ایک راہب جس کا نام ہلینکن برگ ہے (۱۰۹۴ – ۱۱۴۰) ایک عالم مابعد الطبیعات (Metaphysician) اور وجدانی صوفی گزرا ہے، وہ خدا کے متعلق کہتا ہے:

> "خدا اس درجہ فوق العقل ہے کہ ہم تمثیل سے بھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا چیز خدا کے مماثل ہوسکتی ہے؟ زمین آسمان، روح، نفس؟ ان میں سے کوئی چیز خدا نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں یہ چیزیں خدا نہیں لیکن اس سے کچھ نہ کچھ مشابہت ضرور رکھتی ہیں اس لیے ان سے خدا کے تصور میں مدد

Marfat.com

لی جاسکتی ہے۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ روح کا تصور قائم کرنے کے لیے تم جسم کو میرے سامنے پیش کردو جو تصورِ روح کے لیے ایک ناموزوں مثال ہوگی، اور پھر خدا اور نفس کا بُعد تو نفس و جسم کے تفاوت سے بھی زیادہ ہے۔ انتہائی مخالف الفطرت مخلوقات میں بھی اتنا فرق نہیں جتنا خالق اور مخلوق میں ہے۔ للٰہذا عقل سے خدا کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس کا تعلق صرف ایمان سے ہے۔"[1]

اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات بھی ملاحظہ ہوں، وہ لکھتے ہیں:۔

"اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ جس قدر بھی ذات مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرلے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیل من   خاک بر فرقِ من و تمثیل من

..... جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی ہے وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود رفتگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک ہو جائے۔ عرفا کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی کہ رب زدنی تحیّرا (خدایا ایسا کر کہ تیری ہستی میں ہمارا تحیّر بڑھتا ہی رہے) اور حکما کی حکمت و دانش کا فیصلہ بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ:

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"[2]

قرآن کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ ذات، انسانی عقل کے لیے ایک حقیقت مستور ہے جس کی

---

[1] تاریخ فلسفہ صفحہ ۱۹۹ (مصنفہ الفرڈ ویبر) مترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۸ء)

[2] ترجمان القرآن، سورہ فاتحہ صفحہ ۱۸ (مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۶۶ء)

Marfat.com

نقاب کشائی کی ہر کوشش کا نتیجہ ناکامی و نامرادی کی صورت میں منتج ہوگا۔ سورہ بقرہ کی بالکل ابتدائی آیات میں ایک مومن کے اندازِ فکر کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ   وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔

اپنے لیے غیب کا لفظ استعمال کر کے اللہ نے اپنے بندوں کو یہ بتا دیا کہ وہ انسانی عقل و فہم کے لیے ناقابل ادراک ہے، اور اس طرح اس نے انسانوں کو ان تمام عقلی ترکتازیوں سے روک دیا جو اس کی ذات کے ادراک کے لیے ہر دور میں کی گئی ہیں، اور صاف سیدھے لفظوں میں بتا دیا کہ تم اس پر یعنی غیب پر ایمان لاؤ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے لیے ایسا غیب ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس پر ایمان لانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ کسی شے کی غیبوبت کے یہ معنی نہیں کہ وہ ناقابل فہم بھی ہے۔ اگر خدا کی ہستی پوشیدہ ہے تو ہمارے گرد وپیش میں پھیلی ہوئی یہ وسیع کائنات اور خود ہماری ذات تو ہم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر انسان ان پر سنجیدگی سے غور کرے اور اس کے باطن میں اُتر کر دیکھے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کائنات ہستی کا ہر گوشہ ایک صانع کامل کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر کوئی صنعت بغیر کسی صانع کے اور کوئی تنظیم بغیر کسی ناظم کے قائم نہیں ہو سکتی تو پھر یہ بیکراں کائنات اور عقل و شعور کا حامل انسان بغیر کسی عاقل و دانا ہستی کے کیسے وجود میں آسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشہور سائنس داں ڈاکٹر میچل پوپن (Dr. Michael pupin) جو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں الکٹرو میکینکس کے پروفیسر رہے ہیں، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> "سائنس نے کائنات کے جس گوشے کی بھی تحقیق کی ہے اسے وہاں ایک قانونِ نظم و عدل (Coordinating Principle) کارفرما ملا ہے۔ اس سے یہ ایک ناگزیر نتیجہ نکلتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کی پشت پر ایک رہنما اصول موجود ہے جو اسے اختلال اور بے نظمی کے بجائے نظم و ترتیب عطا کر کے اس کے وجود کو قائم رکھتا ہے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ہم اس عالمِ موجودات کو جو بے نظیر نظم و قانون رکھتا ہے، محض ایک اتفاقی واقعہ قرار دیں

یا اسے کسی خاص ذہن کا نتیجہ سمجھیں۔ تم بحیثیت ایک عاقل اور باشعور ہستی کے ان دو باتوں میں سے کس بات کو پسند کرو گے؟

جہاں تک میرا تعلق ہے میں قانونِ عدل و توازن یعنی الٰہیاتی ذہن و شعور (Divine Intelligence) پر یقین رکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ یہ سب سے آسان تر معقول اور قابلِ فہم ہے، اور یہ میرے تمام تجربات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ نظریہ کہ باشعور مخلوق، جیسے ہم ہیں، اور باشعور طرزِ عمل جیسے ستاروں کی رفتارِ حرکت کا ہے، محض بے شعور اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہو، میری فہم سے بالاتر ہے۔ اور پھر میں کیوں اس نظریے کو قبول کروں جبکہ میں ہر روز براہِ راست ذہن و شعور کے حامل متعدد واقعات و آثار کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں۔

جب تم تاروں کو دیکھتے ہو کہ ہر تارا اپنے ہی دائرۂ حرکت میں گردش کر رہا ہے، اور ایک بیج کو دیکھتے ہو کہ وہ ایک متعیّن منصوبہ کے تحت ترقی کر کے درخت بن جاتا ہے، یا جب تم دیکھتے ہو کہ ایک طفل نوزائیدہ ایک خودکار نظامِ عمل کے تحت نشوونما پا کر رفتہ رفتہ ایک مکمل شخصی وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو کیا تم ان تمام واقعات کو محض اتفاقی حادثات کا نتیجہ سمجھتے ہو؟ یقیناً میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ہر قدم پر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے ایک ناظم و آمر ذہن و شعور کام کر رہا ہے۔ سائنس کا اب تک کوئی ایسا انکشاف سامنے نہیں آیا ہے جو اس بات کی تردید کرے، بلکہ سائنس جس قدر گہرائی کے ساتھ کائنات کے قوانین کا مطالعہ کرتی جاتی ہے اسی قدر یہ یقین پختہ تر ہوتا جاتا ہے کہ یہ کائنات ایک الٰہیاتی ذہن و شعور کی حامل ہے[1]۔

خدا کی ذات کے سلسلے میں متعدد دیگر سائنس دانوں نے بھی اسی طرح کے خیالات کا

---

[1] (American Magzine September 1'

اظہار کیا ہے۔ چنانچہ دی گریٹ ڈزائن نام کی کتاب میں جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی، یورپ اور امریکہ کے چودہ بڑے بڑے سائنس دانوں نے اپنی یہ متفقہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ دنیا ایک بے روح مشین نہیں ہے اور نہ یہ محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

(There is a mind behind the veil of matter, give it what name you will.)

مادہ کے پس پردہ ایک دماغ کارفرما ہے تم اسے جو نام بھی چاہو دے لو۔

دنیا کے عظیم سائنس داں البرٹ آئنسٹائن کا یہ فقرہ تو اب شہرت عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے

(I believe in God who reveals himself in the orderly Harmony of the Universe.)

میں خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں جو اس کائنات کی باضابطہ ترتیب اور ہم آہنگی میں خود کو ظاہر کر رہا ہے۔

انگلینڈ کے مشہور ماہر علم نجوم، سر آرتھر ایس ایڈنگٹن نے لکھا ہے:۔

(The old atheism is gone) religion belongs to the Realm of sprit and mind, and can not be shaken)

قدیم انکار خدا کا نظریہ اب داستان ماضی بن چکا ہے۔ مذہب کا تعلق روح اور عقل کی دنیا سے ہے، اور اس تعلق کو ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں دنیا کے جن نامور سائنس دانوں کے خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سائنسی دور میں بھی ارباب علم و خرد کی ایک بڑی تعداد خدا کے وجود پر اعتقاد رکھتی ہے۔ اور یہ میرا یقین کامل ہے کہ جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کی منزلیں طے کرتے جائیں گے، خدا کی ہستی پر انسانوں کا اعتقاد کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتا جائے گا۔ اس کا ثبوت عصر جدید کے بعض نامور سائنسدانوں کے خیالات ہیں۔ ہم یہاں صرف دو سائنسدانوں

لہ کمیونسٹ اور مذہب صفحہ ۱۵، ۱۶ (ظ۔ انصاری) ماخوذ از دیباچہ (پنڈت سندر لال)

Marfat.com

کے خیالات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ایک سائنسدان کا نام پروفیسر سر فرڈ ہائل (Prof.Sir Fred Hoy le) ہے ان کی عمر اس وقت ٦٦ سال ہے۔ اپنے جدید نظریات (New Theories) کی وجہ سے یہ سائنسی دنیا میں ایک ہنگامہ خیز شخصیت سمجھے جاتے ہیں، اور اسی لیے انھیں اس دور کا متنازع فیہ کائناتی پیشین گو (Controversial Cosmic Prophet) کہا جاتا ہے۔

دوسرے سائنسداں کا نام پروفیسر چندر وکرما سنگھی ہے۔ ان کا وطنِ مالوف سری لنکا ہے اور پیدائشی طور سے بدھسٹ ہیں۔ یہ یونیورسٹی کالج کردلیف (Cardiff) میں ریاضیات اور علم نجوم کے استاد ہیں، اور ۱۹۶۶ء سے یہ سر فرڈ ہائل کے رفیق کار کی حیثیت سے متعدد کتابوں کی تصنیف میں ان کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ یہ دونوں سائنس داں ابتدا ہی سے منکر خدا اور مذہب بیزار تھے۔ اور ایک سائنس داں کی حیثیت سے ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ کسی خالق (Creator) کا تصور سائنس کے بالکل خلاف ہے، لیکن اب ان کا یہ خیال یکسر تبدیل ہوچکا ہے۔

پروفیسر سر فرڈ ہائل اور پروفیسر وکرما سنگھی نے جب اپنی کتاب "خلا سے ارتقا" (Evolution from space) کے سلسلے میں آغاز زندگی پر یعنی کیا زمین پر زندگی کا آغاز ریاضیاتی اتفاق کے طور پر ممکن ہے؟ تحقیقی کام شروع کیا تو اختتام تحقیق پر دونوں ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین پر زندگی کا آغاز اچانک اور اتفاقی واقعے کے طور پر ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ایک: ہندسہ کے آگے ۴۰ ہزار نقطے اور بڑھا دو تو یہ ایک ایسا عدد بن جائے گا جو ناقابل تصور ہے۔ بعینہٖ زمین پر زندگی کا آغاز خود بخود اتفاقی طور پر ہونا قابل تصور ہے۔ پروفیسر وکرما سنگھی لکھتے ہیں:

"زمین پر زندگی کو ایک کیمیاوی حادثہ (Chemical Accident) خیال کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مخصوص ریت کے ذرّے کو تمام اجرام سماویہ کے کناروں پر تلاش کرنا اور پالینا ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"محض اتفاقی طور پر بالکل اچانک زندگی کے آغاز کا احتمال ایک فضول سی

Marfat.com

بات ہے۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ طبیعیات کے
مطلوب خواص (Favourite properties) جن پر زندگی کا انحصار
ہے، ہر اعتبار سے ارادی (Deliberate) ہیں۔"

یہ خیالات کسی مذہبی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے کسی عالم دین کے نہیں ہیں کہ ہم انھیں مذہبی خوش اعتقادی اور کورانہ تقلید کا نتیجہ قرار دے کر رد کر دیں، بلکہ یہ خیالات ایک معروف سائنسداں کے ہیں، ایک ایسا سائنس داں جو ابھی تک خود کو اپنے نتائج تحقیقات سے ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

"ایک برتر ذی شعور (Higher Intelligence) خالق کا اعتراف
مجھ سے کہیں زیادہ سر فرڈ ہائل کو ہے۔ میں نے اس تصوّر کے خلاف ان سے
طویل بحث و مباحثہ کیا لیکن میری ہر دلیل رائگاں گئی۔ فی الحال میں کوئی ایسی
عقلی دلیل نہیں پاتا جو اعتراف خدا کے تصوّر کی نفی کر سکے۔ اگر میں کوئی دلیل پاتا
خواہ کمزور ہی سہی، تو اس کتاب کے لکھنے میں سر فرڈ ہائل کا شریک کار نہ بنتا۔
میں اب بھی پُر امید ہوں کہ شاید کسی دن اس نظریے کے ماسوا، زندگی کی کوئی
میکانکی تشریح کر سکوں، کیوں کہ میں ابھی تک ذہنی اعتبار سے اس انقلاب سے
ہم آہنگ نہیں ہو سکا ہوں۔

فی الواقع میرے لیے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا کیوں کہ میں ایک بدھسٹ
ہوں اور بدھ مذہب ایک بے خدا مذہب ہے جس میں تخلیق اور خالق کا کوئی
تصور موجود نہیں ہے، لیکن اعتراف خالق تک مجھے منطق (Logic)
نے پہنچایا ہے۔ کوئی دوسرا ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم کیمیاوی اشیاء
(Chemicals) کے متعین نظم و ترتیب (Precise ordering)
کو سمجھ سکیں بجز اس کے کہ ہم کائناتی سطح (Cosmic scale) پر تخلیق کے
عمل کو قبول کر لیں[1]۔"

---

[1] ہندوستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۶ ستمبر ۱۹۸۱ء، صفحہ ۵

حقیقت یہ ہے کہ تخلیق عالم پر غور و فکر ہمارے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ یہ کائنات کوئی حادثہ اور اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ بلند ترین حکیم و علیم ہستی کی بے نظیر تخلیق ہے[1]

تعبیرات کا اختلاف

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفی اور سائنس داں وجودِ خدا کے منکر ہوتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر دور میں ایسے فلسفی اور سائنس داں موجود رہے ہیں جو خدا کی ذات پر اعتقاد رکھتے تھے، اور آج بھی ایسے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی تعداد کم نہیں ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں۔

دراصل فلسفی اور سائنس داں خدا کے وجود اور اس کی ذات و صفات کے اظہار کے لیے جو الفاظ، اصطلاحات اور اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں، وہ مذہبی الفاظ و اصطلاحات اور تعبیرات سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے اور اسی اختلاف سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خدا کے منکر ہیں۔ اگر تعبیرات کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا جائے تو دونوں جگہ ایک ہی حسن حقیقت کی جلوہ گری ملے گی۔

اہل مذہب جس فوق العقل ہستی کو خدا کہتے ہیں اسی کو ہربرٹ اسپنسر "نامعلوم" (Unknown) اور "ناقابل ادراک" (Unknowable) اسپینوزا "کائناتی جوہر" (Universal Substance) ایمرسن "روح کائنات یا روح کل" (Oversoul) اور کانٹ "فوق تجربی" (Transcedental) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کیا حقیقت مطلق کی ان مختلف تعبیرات سے خود حقیقت بھی مختلف ہو گئی یا اس کا وجود مشتبہ ہو گیا؟ کیا ایک انگور کی حقیقت، انگریزی میں گریپ، عربی میں عنب، فارسی میں انگور، ترکی میں ازم، روسی میں استفیل اور سنسکرت میں درکشا نام پڑ جانے کی وجہ سے مختلف ہو سکتی ہے؟ یا اس کا وجود ان ناموں کے اختلاف کی وجہ سے ناقابل تسلیم ہو سکتا ہے؟

---

[1] مزید تفصیل کے لیے مصنف کی کتاب "تجلیات حق" ملاحظہ فرمائیں۔

تعبیرات (Enterpretations) کا اختلاف کچھ فلسفیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، خود ارباب مذہب کے یہاں بھی تعبیرات کا یہ اختلاف موجود ہے۔ دنیا کا ہر مذہب کسی نہ کسی انسانی زبان سے رشتہ رکھتا ہے۔ زبانوں کے اختلاف سے ہر زبان میں اس ہستیٔ مطلق کے نام بھی مختلف ہو گئے۔ بظاہر یہ کوئی اہم بات نہ تھی لیکن ناموں کے اسی اختلاف کی وجہ سے حقیقت کی تعبیر بھی ہر مذہب میں مختلف ہو گئی۔ اور یہی اختلاف تعبیرات، مختلف ادیان وملل کے درمیان ان کے پیروؤں کی جہالت و بے بصیرتی کے سبب شدید مذہبی نزاعات و کشاکش اور کشت وخون کا باعث بن گیا، اور آج بھی اہل مذہب باہم مصروف پیکار ہیں۔

فلسفہ وسائنس کی زبان ہو یا ادیان ومذاہب کی، ہر زبان میں ہستیٔ مطلق کے جو اسماء و صفات (Names and Attributes) تجویز کیے گئے ہیں وہ دراصل تفہیم وتعبیر کی ایک صورت ہے ورنہ وہ ہستی ان اسماء وصفات میں مقید نہیں ہے۔ اسی طرح اسماء وصفات کے ساتھ جو غلط تصورات ہر دور میں وابستہ ہو گئے ہیں، وہ ہستی ان سے بھی مبرا ہے۔ فی الواقع اس ہستیٔ مطلق کے لیے تمام ہی اچھے نام موزوں ہیں خواہ وہ کسی زبان اور کسی مذہب کے ہوں۔ ہم افہام وتفہیم کی غرض سے اس ہستی کے شایان شان اس کا جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآنی تعلیم حد درجہ حقیقت پسندانہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ (اعراف ۱۸۰)

اور اللہ ہی کے لیے حسن وخوبی کے نام ہیں، تم انہی ناموں سے اس کو پکارو، اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے سلسلے میں کج فکری میں مبتلا ہیں۔

تعبیرات کے اختلاف کے باوجود ہر دور کے اصحاب علم وخرد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ یہ کائنات کوئی بے روح وبے عقل مادّوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ حیرت انگیز عقل وشعور کی حامل ہے۔ پروفیسر ہیگل جو ایک مشہور جرمن فلسفی گزرا ہے، اپنی کتاب "معمّا کائنات" (Riddle of Universe) میں وحدت جوہر (Monism) کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وحدت جوہر کا نظریہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی جوہر (substance)

Marfat.com

موجود ہے جو بیک وقت خدا اور فطرت، اور جسم اور روح (مادہ اور توانائی) دونوں ہے۔ یہ نظریہ ان دونوں کو ناقابل تفریق سمجھتا ہے۔ خالص وحدت جوہر کا نظریہ نہ تو اس نظری مادیت (Theoretical Materialism) کے مماثل ہے جو روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور کائنات کو بے روح جواہر کا ایک انبار قرار دیتا ہے۔ اور نہ ہی یہ نظری روحانیت (Theoretical spiritualism) کے مماثل ہے جو حرکتِ مادہ کے تصور کو رد کر دیتی ہے۔ اور کائنات کو توانائیوں کا یا غیر مادی فطری قوتوں کا ایک مجموعہ خیال کرتی ہے۔ اس کے برخلاف ہم نظریۂ وحدتِ جوہر کے قائلین گوئٹے کے اس نظریئے کے قائل ہیں کہ مادہ روح کے بغیر اور روح مادہ کے بغیر نہ تو صورت پذیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی موثر بن سکتی ہے۔ ہم اسپینوزا کے غیر مبہم وحدت جوہر کے نظریئے پر مضبوطی سے قائم ہیں یعنی یہ کہ مادہ یا بیکراں پھیلا ہوا جوہر، اور روح یا توانائی یا احساس اور غور و فکر کا حامل جوہر دراصل دو اساسی صفات ہیں، یا کائناتی جوہر (Universal substance) کے اہم ترین اوصاف ہیں۔ اسپینوزا نے اس کائناتی جوہر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: وہ جو اپنے وجود کے قیام کے لیے کسی شئے کا محتاج نہ ہو، قائم بالذات، لامتناہی، غیر مشروط اور غیر محدود، لامتناہی کا تعدد نا ممکن ہے۔"[1]

آپ اس اقتباس پر غور کریں۔ آخر میں اسپینوزہ نے کائناتی جوہر کی جو تعریف بیان کی ہے، کیا وہ اسی حیّ و قیوم ہستی کی عین صفات نہیں جسے ہم عربی زبان میں اللہ کہتے ہیں۔ یہ صرف تعبیر کا اختلاف نہیں تو اور کیا ہے؟

تصوّرِ صفات

انسان کے فہم و ادراک کی حقیقت کا اگر آپ گہرائی سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اس

[1] Should religion be abolished, Vol. I, p 280 (Baba Khalil Ahmad, Varansi

Marfat.com

عالم مادی کی ہر چیز کا علم اس کی صفات کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ماہیت اشیاء کے علم سے عاجز ہے۔ اگر آپ کسی شخص سے سیب کی حقیقت دریافت کریں تو وہ فوراً اس کی صفات بیان کرنے لگے گا یعنی سیب کی شکل ایسی ہوتی ہے، رنگ ایسا ہوتا ہے، بو ایسی ہوتی ہے اور مزہ اس طرح کا ہوتا ہے وغیرہ۔ اس نے سیب کی جن مختلف کیفیات کا ذکر کیا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی بذات خود سیب نہیں ہے، بلکہ اس کی کسی نہ کسی صفت کی مظہر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم صفت یا صفات کے مجموعہ ہی سے اشیاء کا علم حاصل کرتے ہیں۔ جب عالم محسوسات کی اشیاء کے متعلق ہمارے فہم و ادراک کی رسائی کا یہ حال ہے تو عالم غیر محسوس کی حقیقت کا ادراک تو ہمارے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ہم عالم غیر محسوس کے سلسلے میں جب بھی تصور کو پر پرواز عطا کریں گے تو بالآخر مجبور ہوں گے کہ اس عالم کے خال و خط کا مشاہدہ عالم محسوس کے آئینہ ہی میں کریں۔

بالکل یہی حال صفات خداوندی کا ہے۔ چونکہ خدا ایک لامحدود اور غیر محسوس ہستی کا نام ہے اور ہمارے تمام علم و احساس کا ذریعہ ہماری محدود عقل و حواس ہیں، اس لیے ہم مجبور ہیں کہ اس کی ذات کا مشاہدہ اس کی صفات کے آئینہ میں کریں۔ اگر ہم اس کے وجود کو صفات کا پیکر عطا نہ کریں یا دوسرے لفظوں میں اسے محسوس، مشخص اور معیّن نہ کریں تو وہ ہمارے دائرہ فہم و ادراک میں نہیں آسکتا۔ اب ایک طرف خدا کی ذات لامحدود ہے جو فہم انسانی کے لیے ناقابلِ ادراک ہے، اور دوسری طرف انسان کی فطرت میں ایک خالق و مالک کا تصوّر اور اس کی طلب و جستجو اور اس کا شوق دید اتنا سخت و شدید ہے کہ وہ کسی صورت سے اس خالق و مالک کے تصور سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔

اب اس کی دو ہی صورتیں تھیں، یا تو اسے ذات مطلق کی تلاش میں سرگرداں چھوڑ دیا جاتا جس کا لازمی نتیجہ گم رہی کی صورت میں نکلتا یعنی انسان معبود حقیقی کو نہ پاکر غیر معبود ہستیوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا جیسا کہ تاریخ کے ہر دور میں معبود حقیقی کے صحیح تصور کے نہ ملنے کی وجہ سے ہوچکا ہے، اور اس کی دوسری صورت یہ تھی کہ اس کی فطری طلب کی تسکین کا کوئی سامان کیا جاتا یعنی اسے معبود حقیقی کے صحیح تصور سے آشنا کر کے اسے غلط روی کے نتائج سے بچا لیا جاتا۔ خدا کی

Marfat.com

ذات، جو رحمت و ربوبیت میں کامل ہے، انسان کی اس فطری ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ اس نے انسان کی فطری طلب کی تسکین کے لیے اپنے لامتناہی وجود کو صفات کا پیرہن عطا کر کے خود کو انسانی عقل و فہم کے لیے قابل ادراک بنا دیا۔

نفی صفات

صفات خدا کے سلسلے میں ہر دور میں معرکۃ الآراء بحثیں ہو چکی ہیں، اور اس سلسلے میں انسانی فکر نے ہمیشہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ارباب علم و خرد کے ایک گروہ نے خدا کو ہر صفت سے منزّہ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ اگر ہم خدا کو کسی صفت سے متصف کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے محدود کر دیا حالانکہ وہ غیر محدود ہے، مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ وہ رحیم ہے تو گویا ہم نے اسے صفتِ رحم میں محدود کر دیا جبکہ وہ رحمت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم کہتے ہیں کہ وہ رحم والا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مخلوق ہستیوں کی طرح رحم سے بہرہ اندوز ہوا ہے۔ اس گروہ کا تنزیہی تصور خدا اس حد تک نازک ہے کہ وہ خدا کے لیے وجود کا لفظ بولنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ جہاں وجود کا لفظ بولا گیا وہ محدود ہو گیا، کیونکہ کسی وجود کا تصور ہم زماں اور مکان کے تصوّر سے ہٹ کر نہیں کر سکتے اور وہ ذات زماں اور مکان سے پرے ہے۔

ہندو ارباب علم نے اس معاملے میں زیادہ نزاکت خیال کا مظاہرہ کیا ہے۔ ذاتِ خدا کے سلسلے میں ان کا قدیم فلسفیانہ تصور یہی ہے کہ وہ ہر صفت سے پاک ہے۔ اس کی طرف کسی صفت کی نسبت کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اپنشد کے الفاظ میں "اس کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا میں اس کا ایک ہی جواب دوں گا: نیتی نیتی یعنی یہ ایسا بھی نہیں، یہ ایسا بھی نہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس طرز فکر کے مطابق ہم نہ صرف ذات مطلق کا کوئی تصوّر قائم نہیں کر سکتے بلکہ اس کا وجود عدم کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ جب وہ کچھ بھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عدم ہے۔

اثبات صفات

اس سلسلے میں دوسرا گروہ ان اہلِ علم کا ہے جو صفات خدا کا قائل ہے۔ یہ گروہ اثبات

Marfat.com

صفات کے جوش سے اس حد تک مغلوب ہوا کہ افراط کی کھائی میں جا گرا۔ اس نے خدا کو صفات کا جامہ اس طرح پہنایا کہ اسے ہر تشبیہ اور تجسم سے آلودہ کر دیا۔ اس کو بالکل انسانی جذبات و احساسات رکھنے والی ہستی قرار دیا یہاں تک کہ اس کو انسانی شکل و صورت کے قالب میں بھی ڈھال دیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کا تصور خدا کسی نہ کسی پہلو سے تشبیہ اور تجسیم سے آلودہ ہے۔ ان کے مذہبی صحائف کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس ہستی کو خدا سمجھتے ہیں وہ اپنے اعمال و افکار کے لحاظ سے انسان سے کچھ زیادہ مختلف واقع نہیں ہوئی ہے۔ انسان ہی کی طرح وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے اور ہر آن مقربین و خدام کی ایک جماعت اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتی ہے۔ انسان ہی کی طرح وہ مغلوب الغضب ہے۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے اور پھر نذر و نیاز اور چند مذہبی رسوم کی ادائیگی سے وہ خوش بھی ہو جاتا ہے۔ جب غضبناک ہوتا ہے تو انتقام کے جوش میں پوری کی پوری آبادی کو تہ و بالا کر ڈالتا ہے، اور جب خوش ہوتا ہے تو انعام و اکرام سے نوازتا ہے حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مصلوب کرا دیتا ہے۔ غرضیکہ ہر وہ کام کرتا ہے جو ایک انسان جوش غضب اور عالم مسرت میں کرتا ہے۔

قرآن حکیم کا تصوّرِ صفات

صفات خداوندی کے سلسلے میں قرآن مجید نے جو راہ اختیار کی ہے وہ حد درجہ اعتدال و توازن کی راہ ہے۔ اس نے ایک طرف تو خدا کی ذات کو ہر صفت اور مثل سے بالاتر قرار دیا، لیس کمثلہ شئ (اس کے مانند کوئی چیز نہیں) یہ دراصل نیتی نیتی کی صدائے بازگشت ہے اور دوسری طرف روح انسانی کی تسکین کے لیے اس کو صفات کے ذریعہ مشخص کیا۔ اس مقصد کے لیے قرآن نے وہ تمام الفاظ اور تعبیرات اختیار کیں جو انسانی فہم کے لیے قابل گرفت ہو سکتی تھیں، لیکن ان کی حیثیت صرف تفہیم و تعبیر کی ہے نہ کہ حقیقی۔

فی الواقع تنزیہہ صفات کی راہ تو آسان ہے لیکن اثبات کی راہ بڑی مشکل اور پُر خطر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے ہر دور میں انسان کی تمام فکری و عملی گم راہیوں کے پس پردہ صفات

Marfat.com

خداوندی کا غلط تصور ہی کار فرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اثبات صفات کے ساتھ ہی صفات خداوندی کا صحیح اور متوازن تصور بھی پیش کیا، اور اس راہ کی تمام کج اندیشیوں کے سدِ باب کے لیے ہر وہ تدبیر اختیار کی جو ایک انسانی زبان اور طریقِ تفہیم میں ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس نے خدا کی صفت رحمت کا ذکر کیا تو یہ بھی بتا دیا کہ وہ شدید العقاب بھی ہے[1] تا کہ کوئی شخص رحمت کا غلط تصور نہ قائم کرلے۔ اسی طرح اگر اس کی صفت ربوبیت کا ذکر کیا تو یہ بھی واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس کائنات میں اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو رب کہلانے کی مستحق ہو[2]۔ اگر خود کو صفت مُلک سے متصف کیا تو یہ بھی کہہ دیا کہ اس کائنات کا وہ تنہا حاکم و آمر ہے، اور اس کار جہاں بانی میں کوئی بھی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے[3]۔ غرضیکہ ہر صفت کی حقیقت سے ہم کو باخبر کر کے فکر و عمل کی ہر لغزش کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج اسی کتاب پر ایمان رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد صفاتِ خدا کے سلسلے میں بے شمار فکری اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہے ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

قرآن پاک میں جس کثرت سے توحید فی الذات کا ذکر ملتا ہے اس سے کہیں زیادہ توحید فی الصفات کا ذکر ملتا ہے۔ عقل و بصیرت کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ جو ہستی اپنی ذات میں یگانہ ہوگی

---

[1] اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (مائدہ:۹۸)

[2] يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ۲۰-۲۱) اے لوگو! اپنے پروردگار کی اطاعت و بندگی کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو پیدا کیا۔ عجب نہیں کہ تم (عذاب جہنم سے) بچ جاؤ — اور جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا، اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے مختلف قسم کے پھل اگائے تمہارے لیے بطور غذا! اس لیے تم دیدہ و دانستہ (دوسروں کو) اللہ کا مقابل نہ بناؤ۔

[3] وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۱۱۱) اور کہہ دو کہ ہر حمد و ستائش اس اللہ کے لیے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے، اور نہ کسی کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

Marfat.com

وہ لازماً اپنی صفات میں بھی یگانہ ہوگی کیوں کہ صفات ذات سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ذات ہی کا پرتو ہوتی ہیں۔

ایمان باللہ کے تقاضے

ایمان باللہ صرف یہی نہیں ہے کہ ہم اس کے وجود کو تسلیم کریں بلکہ اس ہستی پر ایمان لانے کے بعد ہم پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ ہم اسی کو تنہا اس کائنات کا خالق و مالک و ناظم و حکمراں سمجھیں اور جب وہی آقا اور فرماں روا ہے تو پھر وہی ہماری اطاعت و پرستش کا بھی مستحق ہے اس کے سوا اس کائنات میں کوئی زندہ و متحرک وجود ایسا نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی طرح بھی قابل پرستش اور لائق حمد و ستائش ہو۔ کیونکہ اس عالم رنگ و بو کی ہر شے مخلوق اور فانی ہے اور اپنے وجود کے بقا اور اپنی تمام حاجات کی تکمیل کے لیے اسی ایک ہستی کی دست نگر ہے، جب کہ ہستیٔ مطلق غنی اور تمام خواہشات اور حاجات سے کلیۃً منزہ ہے، نیز وہی حیّ و قیوم بھی ہے اور اپنے وجود کے قیام و بقا کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔

اس اعتراف حقیقت کے بعد ہم کو چاہیے کہ ہم اپنا سر اسی کے آگے جھکائیں اور اس کے آستانے کو چھوڑ کر کسی غیر کے آستانے کو اپنے سجدوں سے زینت نہ بخشیں، صرف اسی کو اپنا حاجت روا مشکل کشا اور فریاد رس سمجھیں، اور اپنی تمام جسمانی اور روحانی احتیاجات میں اسی کی طرف رجوع کریں، مشکلات و مصائب میں دست گیری کے لیے اسی کو آواز دیں، اور زندگی کے ہر موڑ پر اسی ایک ذات پر کامل اعتماد و توکل کریں، کیونکہ تنہا وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ہماری تمام حاجتیں پوری کر سکتی اور ہر غم و ابتلا سے ہم کو نجات دے سکتی ہے۔ ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہو کہ نفع و نقصان، راحت و رنج، عزت و ذلت، مال و منال، ملک و حکومت اور طاقت و عظمت کا سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ کسی کے ساتھ خیر کا ارادہ کرلے تو پھر ساری دنیا مل کر بھی اس کو اس ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی، اور اگر کسی کے کرتوتوں کے سبب اس کو رنج و اذیت میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کو اس اذیت سے گلو خلاصی بخش سکے۔ وہ خود فرماتا ہے:

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ

Marfat.com

فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ (یونس)

اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو نہ پکار جو نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ کوئی نقصان اور اگر تونے ایسا کیا تو تمہارا شمار ظالموں (مشرکوں) میں ہوگا۔ اگر اللہ تمہیں کسی تکلیف میں مبتلا کر دے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس تکلیف سے تم کو نجات دے سکے۔ اور اگر تمہیں کسی بھلائی سے نوازنے کا ارادہ کرے تو پھر کوئی نہیں جو اس کو ایسا کرنے سے روک دے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وہ تنہا ہر حال میں دعاؤں کا سننے والا اور اس کو قبول کرنے والا ہے۔ اس لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے بلا واسطہ اسی کی طرف رجوع کریں، اور ہر مشکل وقت میں اسی کو پکاریں کہ وہی قسمتوں کا بنانے والا اور بگاڑنے والا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ ... (بقرہ: ۱۸۶)

جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو انھیں بتلا دو کہ میں (ان سے کچھ دور نہیں) ان کے بالکل قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو اس کی پکار کو میں سنتا ہوں۔ پس ان کو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ (نمل: ۶۲)

اس کے سوا کون ہے جو کسی بے قرار کی پکار سنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارتا ہے، اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔

ہم اس بات پر دل سے یقین رکھیں کہ وہ ذات مطلق ہمارے ظاہر و باطن اور کائنات کے ہر پست و بلند اور عیاں و نہاں سے بخوبی آگاہ ہے یعنی وہ عالم غیب و شہادت ہے۔ یہ ہمہ گیر علم غیب اس کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہے خواہ وہ فرشتے ہوں، خواہ انبیاء ہوں اور خواہ کوئی صالح بندۂ خدا ہو۔ وہی سینوں کے مخفی رازوں اور دل و دماغ میں اٹھنے والے تمام وساوس کا جاننے والا ہے۔ خدا کے اس ہمہ گیر علم غیب کا تقاضا ہے کہ ہم کھلے اور چھپے ہر حال

میں اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں اور اس کے سوا کسی سے بھی نہ ڈریں کہ یہ ایمان باللہ کے منافی ہے (واخشونی ولا تخشوالناس)

اسی کے ساتھ ہم یہ بھی یقین رکھیں کہ اس کارخانۂ عالم کا سارا نظام اسی کے حکم سے چل رہا ہے، کسی بھی مخلوق کو اس پر ادنیٰ تصرف بھی حاصل نہیں ہے، تصرف تو کجا نظام عالم ان کی مشورت کا بھی محتاج نہیں ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے کاروبارِ سلطنت میں شریک وسہیم ہو۔ وہ ہر رشتہ و نسب سے پاک اور یاری و مددگاری سے بے نیاز ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾ (بنی اسرائیل ۱۱۱)

کہہ دو ساری تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے، اور نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے، اور نہ ہی کسی کمزوری کے سبب کوئی اس کا یار و مددگار ہے۔ اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

اللہ کی حاکمیت ناقابل تقسیم ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آسمانوں میں تو اس کی حاکمیت کارفرما ہو اور زمین پر انسان کی حاکمیت چلے۔ ارض و سما دونوں کا وہی تنہا حاکم ہے، اس لیے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ اس کو حاکم و فرماں روا مان کر عملاً اس کے حکموں سے انحراف یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم نے حقیقی معنوں میں اسے اپنا حاکم و آقا تسلیم نہیں کیا ہے کیا یہ بات عجیب نہیں کہ ساری کائنات تو اس کے حکموں کا اتباع کرے لیکن انسان دین فطرت یعنی اسلام سے روگردانی کرے، اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلانے کے بجائے اپنے قانون اور اپنی مرضی کو نافذ کرے۔ انسان کا یہ طرز عمل صریح بغاوت ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ اس طرز عمل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں حاکمیت و حکم لازم و ملزوم ہیں۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ (اعراف: ۵۴) سن لو تخلیق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔

فرشتوں پر ایمان

فرشتے دراصل خدا کی غیر مادی مخلوق یا غیر مادی ارواح مجردہ ہیں۔ خدا نے ان کو اس لیے

خلق کیا ہے کہ وہ اس کی تقدیس و تمجید کریں اور اس کے متعین احکام و قوانین کے مطابق نظام عالم کی نگہبانی کریں، اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی میں اطاعت و انقیاد کی خو رکھ دی ہے۔ تمرد و سرکشی اور ذاتی ارادہ و اختیار کے اوصاف سے وہ بالکلیہ محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب وہ کوئی ذاتی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے تو پھر حکم خدا سے سرتابی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں فرشتوں کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ صابئی انھیں اجرام فلکی کی صورت میں مانتے ہیں۔ قدیم اہل فلسفہ انھیں عقول عشرہ قرار دیتے ہیں، پارسیوں کے یہاں ان کا نام "امشاسپند" ہے اور یہودیوں کے یہاں "کروبیم" اور خاص خاص فرشتوں کو جبرائیل اور میکائیل بھی کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے یہاں جبریل و روح القدس کی صورت میں ان کا وجود ملتا ہے۔ ذہن ہندی انھیں دیوی اور دیوتا قرار دیتا ہے۔ خود اہلِ عرب دور جاہلیت میں انھیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ (زخرف - ۱۹)

ناموں کے اس اختلاف کے باوجود ایک حقیقت سب کے یہاں مسلّم تھی کہ یہ با اختیار اور قابلِ تعظیم ہستیاں ہیں۔ اختیار اور عظمت کے ساتھ ان کی پرستش ناگزیر ہے۔ چنانچہ تقریباً ہر مذہب میں کم و بیش ان کی پرستش کی گئی ہے۔ صابئی ان کے ہیکل بناتے اور ان کو مظہر خدا تسلیم کرتے تھے۔ عرب انھیں خدا کی بیٹیاں قرار دے کر ان کی عبادت کرتے تھے اور خدا کے دربار میں انھیں اپنا شفیع قرار دیتے تھے۔ یہی حال زمانہ قدیم میں یونانیوں اور دیگر اقوام عالم کا تھا۔ اہل ہنود کے یہاں تو آج بھی ان کی پرستش دیویوں اور دیوتاؤں کی صورت میں جاری ہے۔ ان کو چھوڑیئے کہ ان کا شمار اہلِ کتاب میں نہیں ہے، تعجب تو یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے یہاں بھی اس سلسلے میں کافی غلو سے کام لیا گیا ہے۔ یہودی صحیفوں میں فرشتوں کی تقدیس اور تعظیم جن الفاظ میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں صاحب اختیار سمجھتے تھے۔ جسد بشری میں جو فرشتے کبھی زمین پر آ جاتے تھے ان کی تعظیم کی جاتی تھی، ان کے آگے جھک کر انھیں خداوند کے لفظ سے جو ان کے یہاں خدا کے لیے بھی مستعمل ہے، خطاب کیا جاتا تھا[1]۔ عیسائیوں نے تو صاف صاف ایک فرشتے کو عقیدۂ تثلیث کا ایک

[1] تکوین: باب ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۲، ۲۳۔

Marfat.com

جزو قرار دے کر شریک الوہیت کر لیا۔

فرشتوں کے بارے میں یہ تھے مختلف مذاہب کے تخیلات اور ان کے پیروؤں کا طرزِ عمل اسلام نے ان تمام باطل عقائد اور تصورات کو یک قلم منسوخ کر کے فرشتوں کی اصل حیثیت کو دنیا کے سامنے رکھا۔ اس نے بتایا کہ فرشتے بھی انسان ہی کی طرح مخلوق ہستیاں ہیں۔ ربانی صفات اور خدائی اختیارات کا حامل ہونا تو درکنار وہ سرے سے کسی اختیار کی مالک ہی نہیں ہیں۔ ان کا کام صرف خدا کے احکام کو بجالانا اور اس کی بے چون وچرا اطاعت کرنا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی تقدیر بنانے اور بگاڑنے کا کوئی اختیار رکھتی ہیں اور نہ ہی خدا کے حضور اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے مجاز ہیں، غرض یہ کہ وہ بالکل عاجز و بے اختیار ہستیاں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بے اختیار ہستی کی عبادت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ انھیں بے اختیار اور ناسزاوار پرستش قرار دیا، بلکہ خود انھیں کو انسان کے آگے سربسجدہ کر دیا۔ فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا فی الواقع انسان کی عظمت و برتری اور رفعت و سربلندی کا مظہر ہے۔ اس تلمیح کے ذریعہ اللہ نے انسان کو بتایا کہ وہ کس مقام و منصب پر فائز ہے۔ اب یہ انسان کی نادانی و کم نظری ہے کہ مسجودِ ملائک ہو کر وہ اپنے سے کمتر مخلوقات کی پرستش کرنے لگے یا اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا سجدہ گاہِ شوق بنا لے یا خود فرشتوں ہی کو اپنا مسجود بنا لے۔ اللہ کا یہ کتنا احسان عظیم ہے کہ اس نے انسان کو صرف اپنے آستانے پر جھکنے کا حکم دے کر ساری کائنات کو اس کے آگے سرافگندہ کر دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے۔

ایمان بالملائک کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم ان کو خدا کی مخلوق اور بے اختیار ہستیاں سمجھیں، اور صرف خدا کی ذات کو ہر حمد و ستائش کا مستحق اور اسی کو لائق پرستش قرار دیں۔ رہا فرشتوں کے وجود کا عقلی ثبوت تو اس سلسلے میں ہم بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا وجود ہمارے لیے خدا ہی کی طرح ناقابل مشاہدہ ہے۔ ان پر ہمارے علم و یقین کا سارا مدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر ہے۔ آپ نے خدا کے فرشتہ کو نہ صرف انسانی شکل و صورت میں دیکھا بلکہ اسے اس کی خلقی صورت میں بھی دیکھا ہے۔ یہ خدا کا فرشتہ ہی تو تھا جو آپ کے پاس کلامِ ربانی لاتا تھا۔

Marfat.com

اس فرشتہ کا نام جبرئیل ہے۔ یہ وہی فرشتہ ہے جو انسانی صورت میں پہلی بار غار حرا میں آپ کے پاس آیا تھا، اور اسی فرشتہ کی معیت میں سفر معراج پیش آیا تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارے رسول کا ذاتی مشاہدہ اس بات کی صداقت کے لیے کافی ہے کہ فرشتے موجود ہیں، کیونکہ ہم رسول کو ان کی تاریخ حیات و کردار کی روشنی میں ایک صادق اور راستباز انسان سمجھتے ہیں۔ جو شخص اپنی پوری زندگی میں ایک بار بھی کسی انسان سے جھوٹ نہیں بولا وہ خدا اور اس کے فرشتوں کے سلسلے میں دروغ گوئی اور افترا پردازی کا مرتکب ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے فرشتوں کے وجود، ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کے سلسلے میں ہم اپنے رسول کی تعلیمات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہر شخص کا مشاہدۂ عینی ضروری نہیں ہے، بلکہ دوسروں کا مشاہدہ بھی یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر اس کو اصولاً تسلیم نہ کیا جائے تو پھر خلقت کائنات کے متعلق سائنس کے بیشتر انکشافات ناقابل تسلیم قرار پائیں گے، کیونکہ وہ عام انسانوں کے لیے ناقابل مشاہدہ ہیں بلکہ بہتوں کے لیے ناقابلِ فہم بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہر سائنسی تحقیق کو تسلیم کرتے ہیں کہ آج کے سائنس داں بغیر تجربہ و مشاہدہ کے کوئی بات نہیں کہتے، یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مشاہدہ اور تجربہ بعد کے کسی مشاہدہ و تجربہ سے غلط قرار پا جائے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو وہ بلا پس و پیش غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے خلوصِ عمل اور دیانتِ فکر و نظر کو ہر شک و شبہہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

لیکن دین کے معاملہ میں ہمارا یہ اندازِ فکر بدل جاتا ہے، اور کتنے ہی جدید تعلیم یافتہ حضرات بلا توقف یک لمحہ مذہبی اعتقادات کو لایعنی کہہ کر رد کر دیتے ہیں گویا کائنات کی ہر حقیقت کا انھیں پورا علم حاصل ہو چکا ہے۔ یہی طرزِ عمل وہ فرشتوں کے وجود کے متعلق بھی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ وہ ناقابل مشاہدہ و تجربہ ہیں اس لیے ناقابل تسلیم ہیں، حالانکہ تاریخ کے ہر دور میں انسانی سماج کے صالح ترین انسانوں نے جنھیں مذہب میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے، ان کے وجود کی خبر دی ہے۔ اگر ہم انھیں صادق اور اپنی تعلیم میں مخلص سمجھتے ہیں تو پھر ان کا یہ کہنا کہ ہم نے فرشتوں کو دیکھا ہے، ہمارے لیے کیوں قابلِ تسلیم نہ ہو؟

Marfat.com

ایک شخص جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ انبیاء کی دی ہوئی خبروں پر بھی ایمان رکھے یہی فرشتہ تو ہے جو وحی وہدایت ربّانی کا وسیلہ ہے۔ اس کے وجود کو تسلیم نہ کرنا گویا پورے سلسلۂ ہدایات ربّانی سے انکار کرنا ہے۔ اور ایسا کر کے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ ایمان کے ایک جزو کی تکذیب کرتا ہے اور جو ایمان کے ایک جزو کی بھی تکذیب کرے وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

تمام ہی انبیاء و رُسل خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں ان کا زمانۂ بعثت ماضی بعید ہے۔ خود خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس طویل ترین مدت میں نسل انسانی ذہنی انقلابات کے متعدد مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ اور فکر و نظر کی دنیا میں سینکڑوں تبدیلیاں آچکی ہیں۔ آج اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہے کہ جو انبیاء و رسل ماضی بعید میں گزر چکے ہیں ان کی نبوّت و رسالت کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ یعنی یہ ہم کیسے مان لیں کہ وہ واقعی خدا کے فرستادہ رسول اور نبی تھے، اور یہ کہ اُن پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی، اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خدائی تعلیمات ہیں؟

یہ سوال کچھ اسی دور کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ تاریخ کے ہر دور میں ہر نبی کی بعثت کے وقت اس دور کے انسانوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو چکا ہے۔ سوال کی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلے ہم اسی کا جائزہ لیں گے، کیوں کہ اگر رسول کی رسالت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو بقیہ دوسرے عقائد کی صحت وصداقت خود بخود ثابت ہو جاتی ہے۔

ثبوت رسالت

ثبوت ہمیشہ دعویٰ کے اعتبار سے طلب کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کہے کہ وہ شاعر ہے تو اس دعویٰ کے ثبوت میں یہی کہا جائے گا کہ اچھا اگر تم شاعر ہو تو شعر کہہ کر سناؤ۔ اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم لوہے کا اوزار بنا کر دکھا دو تو تمہارا دعوائے شاعری تسلیم کر لیا

جائے گا۔ شاعری کا حدادی سے کیا تعلق؟ دعویٰ تو اس نے شاعری کا کیا تھا نہ کہ حدادی کا۔ اگر کسی کو اس کے دعوائے شاعری میں تردّد ہو تو ثبوت میں شعر کہلا کر دیکھ لے۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ معمار ہے تو آپ اس سے ایک مکان تعمیر کرا کے دیکھ لیں کہ اس کا دعوائے معماری کہاں تک صحیح ہے؟ لیکن اگر آپ دعوائے معماری کے ثبوت میں اس سے معالجہ کا مطالبہ شروع کر دیں تو وہ غریب اس کے سوا اور کیا کہے گا کہ بھائی میں نے طبیب ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا جو آپ مجھ سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں۔ میں نے تو فن تعمیر کی بات کہی تھی اس میں اگر کسی کو شبہہ ہو تو وہ ایک مکان بنوا کر دیکھ لے کہ میں واقعی معمار ہوں یا نہیں؟[1]

یہی معاملہ ایک نبی اور رسول کا بھی ہے۔ ایک نبی اور رسول کا دعویٰ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے منصبِ رسالت پر مامور کیا گیا ہے، اور کارِ رسالت، انسانوں کو سچائی کی راہ دکھانا اور بری راہ سے بچانا اور ان کے نتائج سے ہر شخص کو خبردار کر دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک رسول کا کام تبشیر و انذار ہے جیسا کہ آخری رسول کی رسالت کے سلسلے میں قرآن میں آیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (بنی اسرائیل: ۱۰۵)

(اے محمد) ہم نے تم کو صرف ایک مبشّر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے)

یہی بات قرآن مجید میں دوسرے متعدّد مقامات پر کہی گئی ہے، لیکن اس حقیقت کے باوجود کفار مکہ نے دعوائے رسالت کے ثبوت میں جو فہرست مطالبات پیش کی وہ یہ تھی:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ... (بنی اسرائیل: ۹۰ تا ۹۳)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ

---

[1] یہ طرز استدلال ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

کردو، یا تمہارے لیے کھجور اور انگوروں کا کوئی باغ ہو اور اس باغ کے بیچ بیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا جیسا کہ تمہارا دعوٰی ہے، تم آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرادو، یا اللہ اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو، یا تمہارے پاس سونے کا گھر ہو یا تم (ہمارے سامنے) آسمان پر چڑھ جاؤ، اور ہم تمہارے چڑھنے کا بھی اعتبار نہ کریں گے جب تک کہ تم (آسمان سے) کوئی تحریر ہم کو لا کر نہ دے دو جسے پڑھ کر ہم تمہاری صداقت کا یقین کریں۔

کفار مکہ کے ان مطالبات کے جواب میں وحی الٰہی نے زبانِ رسالت مآب سے جو کچھ کہلایا وہ بس یہی کہ:

سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل: ۹۳)

پاک ہے میرا رب (ہر نقص سے) کیا میں ایک بشر اور رسول کے علاوہ بھی کچھ ہوں؟

قرآنی بلاغت کا یہ اعجاز دیکھیے کہ چند لفظوں میں کفار کے تمام مطالبات کا جواب دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی میں نے یہ دعوٰی کب کیا تھا کہ میں خدائی اختیارات کا مالک ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک بشر ہوں اور کوئی بشر خدائی اوصاف و اختیارات کا مالک نہیں ہوتا۔ میرا کام تو پیغام رسانی ہے یعنی میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ بندگانِ خدا کو اس کے خالق و مالک کی مرضی و نامرضی سے آگاہ کردوں، اور اسے وہ راہ بتادوں جو سعادت و کامرانی کی راہ ہے اور وہ راہ بھی بتادوں جو بدبختی اور خسران کی راہ ہے۔ تم اگر میری آزمائش کرنا چاہتے ہو کہ میں مامور من اللہ ہوں کہ نہیں تو یہ دیکھو کہ جس صداقت کی راہ پر تم کو چلنے کی دعوت دیتا ہوں خود اس پر عمل پیرا ہوں کہ نہیں؟ اور تمہارے روحانی امراض کے لیے جو نسخۂ شفا میں نے تجویز کیا ہے اس کو استعمال کر کے تمہارے روحانی امراض دور ہوتے ہیں یا نہیں؟ اور راہ صداقت پر چلنے کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں جس فوز و فلاح اور رفعت و سربلندی کا میں نے تم کو یقین دلایا ہے تم اس دولت گراں بہا سے بہرہ ور ہوتے ہو یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جو رسول بھی دنیا میں آیا اور انسانوں کو صداقت کی راہ دکھائی وہ اس پر خود کامل طور پر نہ چلا ہو، اور جو اُمورِ صداقت اس نے بیان کیے وہ آگے چل کر انسانی علم و تجربہ کی روشنی میں غلط ثابت ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ خیر و صداقت کی جو راہ نوع انسانی

Marfat.com

کو دکھائی اس پر چل کر انسانوں کو فوز و فلاح حاصل نہ ہوئی ہو۔ فی الواقع ایک رسول کی صداقت کی بنیاد انھی تین باتوں پر ہے یعنی رسول کی سیرت و کردار، رسول کی تعلیمات کا مصدر و ماخذ، خود رسول یا اس کے پیروؤں کی دینی و دنیوی فوز و فلاح۔

ان تین باتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم انبیاء و رسل کی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو تینوں ہی باتیں یکجا نظر آتی ہیں۔ تمام انبیاء و رسل اپنے معاشرے کے بہترین انسان رہے ہیں، اور تمام ممکنہ اوصاف حمیدہ ان کے اندر موجود تھے۔ دشمنوں نے ان کی تعلیمات کو تسلیم کرنے سے انکار تو کیا لیکن کبھی ان کی سیرت و کردار پر انگشت نمائی کی جرأت نہیں کر سکے۔ ہم کو کوئی نبی اور رسول بھی ایسا نہیں ملتا جس کی زندگی شان و شوکت کی زندگی رہی ہو، شان و شوکت تو درکنار انھوں نے اپنی پوری زندگی عسرت و تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی حالت میں گزاری۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جن انبیاء و رسل کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر غلبہ و اقتدار بخشا ان کا طرز زندگی بھی انتہائی سادہ اور فقیرانہ تھا، اور وہ زندگی کی آخری سانس تک زہد و قناعت اور استغناء کی شاہراہ سے سر مو منحرف نہیں ہوئے۔

کیا ایسے صالح ترین اور نیکوکار اشخاص سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دروغ گوئی کے مرتکب ہوں گے یعنی خدا کے رسول نہ ہوتے ہوئے بھی اس بات کے دعویٰ دار ہوں گے کہ وہ خدا کے رسول ہیں؟ اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس دعویٰ سے ان کا مقصود کسی مادی منفعت کا حصول بھی نہ تھا، کیوں کہ اس دعویٰ کے نتیجے میں وہ ہر طرح کے شدید مصائب و آلام سے دوچار ہوئے، اور کتنوں ہی کو دار و رسن کی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء و رسل کی پاکیزہ زندگیاں اور ان کا بے مثال کردار خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ غیر معمولی انسان تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس سیرت و کردار کے مالک صرف وہی خدا کے بندے ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ منصب نبوت کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے سیرت و کردار کی اس بلندی پر پہونچنا ممکن نہیں ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس پہلو سے جب ہم پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو

Marfat.com

وہ ہم کو بالکل منفرد نظر آتی ہے ۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ آپ کی پوری زندگی حسن کردار کا ایک مثالی نمونہ تھی یہاں تک کہ آپ کے دشمن بھی آپ کے کردار کی بلندی اور حسن اخلاق کے قائل تھے ۔ آپ سارے عرب میں امین وصادق کے لقب سے مشہور تھے ۔ بچپن سے لے کر آغاز نبوت تک کوئی ایک ایسا واقعہ بھی نہیں ملتا جو آپ کی پیغمبرانہ حیثیت کے منافی یا اس سے کم تر ہو ۔ میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے ۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ آپ کی سیرت و کردار سے متعلق چند غیر مسلم اہل علم کے خیالات پیش کروں گا ۔

جرمن مصنف ڈاکٹر گستاف وائل (Gustav weil) نے اخلاق نبوی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے :

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے ۔ آپ کا کردار پاک اور بے داغ تھا، لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی، مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم و تکریم قبول نہیں فرماتے تھے، اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے، آئے دن آپ بازاروں میں سودا خریدتے اور گھر میں کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بکری دوہتے نظر آتے تھے، ہر وقت ہر شخص کی آپ تک رسائی ہو سکتی تھی ۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے، آپ کی سخاوت اور خیر و خیرات کی کوئی حد نہ تھی، باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی آپ نے نہایت مختصر ترکہ چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو ہبہ فرما گئے تھے ۔"[1]

شہرہ آفاق مورخ جو سلطنت روما کے زوال (Down and Fall of Roman Empire) کا مصنف بھی ہے ۔ آپ کی بلندیٔ کردار کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے :

---

[1] مقالات سیرت، صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹، مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ۔

"اپنی دنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمد کی شرافت نفس نے شاہانہ تزک واحتشام روا نہ رکھا۔ خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا، آگ روشن کرتا تھا، جھاڑو دیتا تھا، بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا، اور اپنے کمبل اور جوتوں کی مرمت خود کرلیا کرتا تھا۔ تارک الدنیا راہبوں کے مجاہدوں سے نفرت کرتے ہوئے آپ بلا تصنع و تکلف ایک عرب اور سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے، خاص خاص مواقع پر آپ صحابہ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے، مگر نجی زندگی میں اکثر آپ کے گھر میں ہفتوں چولھا نہیں جلتا تھا۔"[1]

کیا اس سیرت و کردار کے مالک انسان کے متعلق ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا شخص بھی جھوٹا ہو سکتا ہے تو پھر تسلیم کرنا ہوگا کہ آج تک تاریخ انسانی میں کوئی سچا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اگر یہ بات ناقابل تسلیم ہے تو پھر پہلی بات بھی ناقابل تسلیم ہے۔

ایک رسول کی رسالت کا دوسرا بڑا ثبوت اس کی تعلیمات کا مصدر و مآخذ ہے۔ دنیا کے وہ تمام ارباب علم و خرد جنھوں نے علم و دانش کے میدان میں اپنی عقلی برتری اور علمی عظمت کے لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے کسی صاحب علم سے علمی استفادہ نہ کیا ہو، اور جس کے سارے علمی نظریات وافکار مختلف مراحل تغیرات سے نہ گزرے ہوں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تضاد اور نقص سے محفوظ رہے ہوں۔ اس سلسلے میں استثنائی حیثیت صرف پیغمبروں کو حاصل رہی ہے۔ انھوں نے نہ تو کسی انسان سے علمی استفادہ کیا اور نہ ہی ان کے افکار و نظریات کسی مرحلہ میں بھی ادنیٰ تغیر و تبدل سے آشنا ہوئے۔ جو دعوت حق انھوں نے پہلے دن دی وہ آخر تک اسی صورت میں قائم رہی۔ ابتدا اور انتہا میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ملتا ہے۔ پھر انھوں نے جو کچھ علمی حیثیت سے دنیا

---

[1] مقالات سیرت، صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹، مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

Marfat.com

کے سامنے پیش کیا وہ ہر طرح کے نقص اور افراط و تفریط سے پاک رہا ہے، اور تاریخ کے کسی دور میں ان کی ایک بات بھی غلط ثابت نہ ہو سکی۔

اس پہلو سے بھی سب سے نمایاں حیثیت نبی اُمّی کی ہے جو نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا آپ جس ملک و معاشرہ میں پیدا ہوئے وہ بھی علم و حضارت کے اعتبار سے کوئی ترقی یافتہ ملک نہ تھا۔ لیکن اصلاح معاشرہ اور فلاح آخرت کی جو دعوت آپ نے دی وہ اخلاقی حیثیت سے اتنی بلند، انسانی فطرت و مزاج سے اتنی ہم آہنگ، اور علمی اعتبار سے اتنی پختہ اور کامل ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی افادیت اور کاملیت آج بھی کسی پہلو سے داغدار اور بے اثر نہیں ہو سکی ہے۔ جو علمی حقائق اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں وہ زمانۂ ماضی اور حال کے ہر علمی انکشاف کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہیں، بلکہ یہ انکشافات اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں سے نمایاں تر کرتے جا رہے ہیں۔ سائنس کے جدید انکشافات ہوں یا محکمۂ آثار قدیمہ کی تحقیقات، ان میں سے ایسی کوئی چیز بھی اب تک سامنے نہیں آئی ہے جو قرآن میں بیان کردہ حقائق اور تاریخی واقعات کے خلاف ہو[۱]

کسی ناخواندہ شخص کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ دنیا کو ایک ایسا ضابطۂ اخلاق اور نظریۂ زندگی دے جائے جو ہر حیثیت سے کامل ہو اور ہر عہد کی ضروریات کے عین مطابق بھی ہو۔ خود تو ناخواندہ ہو لیکن اپنا مخاطب اہل علم و عقل کو بنائے اور صاف کہہ دے وما یذکر الا اولی الالباب (نصیحت تو صرف اہل عقل و فکر ہی قبول کرتے ہیں) انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (اللہ سے تو صرف اہلِ علم ہی ڈرتے ہیں) — اور جو عقل سے کام نہ لے اس کو جانور قرار دے صم بکم عمی فھم لا یعقلون (گونگے، بہرے، اندھے ہیں وہ عقل سے کام نہیں لیتے) اور جو علم کے باوجود بے عملی اور بے راہ روی کی زندگی گزارے اس کی تمثیل میں حسن تمثیل کا حق ادا کر دے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب "تجلیات حق" (عنوان دلائل قرآن)

Marfat.com

اَسۡفَاۡرًاؕ (جمعہ: ۵)

جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انھوں نے اس کا بوجھ نہ اٹھایا (یعنی اس کے حکموں پر عمل نہیں کیا) ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

ایک رسول کی رسالت کا تیسرا بڑا ثبوت اس کی تعلیمات کا اثر و نفوذ اور اس کا یا اس کے پیروؤں کا دنیوی غلبہ و سربلندی ہے۔ اس اعتبار سے بھی ہم کو انبیاء و رسل کی زندگیاں بڑی مہتم بالشان دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی دعوت و تعلیمات کے غلبہ و نفوذ کو باطل طاقتیں کبھی نہیں روک سکیں اور خود ان کی زندگی میں یا اُن کے بعد ان کے پیروؤں کو ہر طرح کا دنیوی عروج و سربلندی حاصل ہوئی۔ اس پہلو سے بھی آخری پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کو جو سرخروئی اور عظمت و سرفرازی ملی وہ تاریخ انسانی کا ایک روشن باب ہے۔

آنحضورؐ نے جس مشرکانہ ماحول میں دعوت توحید کا آغاز کیا وہ کسی پہلو سے بھی اس دعوت کے لیے سازگار نہ تھا۔ آغاز دعوت ہی میں باشندگان مکہ نہ صرف آپ کی دعوت کے مخالف ہو گئے بلکہ آپ کی جان کے بھی دشمن بن گئے۔ لیکن آپ ان کی مخالفت اور ایذا رسانی سے ذرّہ برابر ہراساں نہ ہوئے، اور اپنی دعوت کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر ممکن جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ اس راہ میں جو بھی شدائد و مصائب پیش آئے آپ نے ان کو خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیا، لیکن اپنے نصب العین سے کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہوئے یہاں تک کہ ۲۳ سال کی مختصر مدت میں آپ اس مخالف ماحول پر غالب آ گئے، اور مرکز کفر و شرک (مکہ) پر قبضہ کر کے مخالفین و اعداء کی قوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا، یہی نہیں بلکہ قرب و جوار کی حکومتیں بھی یکے بعد دیگرے آپ کے زیرنگیں ہو گئیں۔

یہ انقلاب محض کوئی سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب تھا جس کے اثرات سے زندگی کا کوئی شعبہ بھی خواہ وہ اخلاقی ہو، خواہ معاشی اور خواہ معاشرتی، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو ملک و معاشرہ اخلاقی اعتبار سے پست تر تھا اس اسلامی انقلاب کے نتیجے میں اس کے رہنے والوں کا اخلاق انتہائی بلند ہو گیا، اور وہ تمام اخلاقی معائب جو ان کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے ان کی زندگی سے ایک ایک کر کے

رخصت ہو گئے، جس ملک کے اکثر باشندے معاشی زبوں حالی میں مبتلا تھے وہ دفعتہً خوش حالی سے ہمکنار ہو گئے اور غریب و امیر کے درمیان معاشی عدم مساوات کی جو بلند دیواریں حائل تھیں وہ سب منہدم ہو گئیں، جس معاشرے میں ظلم و ستم اور قتل و خوں ریزی کا ہر طرف دور دورہ تھا اب وہ عدل و اخوت کا ایک مثالی نمونہ بن گیا، نیز جو خطّۂ ارض سیاسی اعتبار سے انتہائی غیر منظم اور پراگندہ تھا وہ متحد اور منظم ہو گیا، ایسا متحد اور منظم کہ جس کی مثال پیش کرنے سے زمانہ قاصر ہے۔ کیا اتنا بڑا سیاسی اور روحانی انقلاب تنہا ایک شخص برپا کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے یہ بے مثال سیاسی و روحانی انقلاب برپا کیا وہ یقیناً خدا کا رسول تھا، کیونکہ خدائے بزرگ و برتر کی نصرت و تائید کے بغیر کوئی شخص اتنی قلیل مدت میں اس طرح کا ہمہ گیر سیاسی اور روحانی انقلاب برپا نہیں کر سکتا ہے۔

آپ ایک رسول کی رسالت کا انکار صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ان تمام حقائق کو نظر انداز کر دیں، اور یہ بات بھی فراموش کر دیں کہ خدا ہر دور میں ایسے اشخاص تو پیدا کر سکتا ہے جو انسانی دماغ کے ارتقائی عمل میں معاون بنیں اور اس کی تمدنی ضروریات اور مادّی حاجات کی فراہمی کی نئی نئی راہیں نکالتے رہیں لیکن وہ ایسے اشخاص پیدا نہیں کرے گا جو انسان کی روحانی زندگی کی تعمیر و تہذیب کا کام انجام دیں اور اسے اخلاق و انسانیت کے پیکر میں ڈھال کر انسانی معاشرہ کو اطمینان و سکون اور خیر و عدل کی دولت سے بہرہ ور کریں۔ آج بھی خیر و عدل کے جو باقیات انسانی معاشرے کے کسی گوشے میں نظر آجاتے ہیں وہ انبیاء و رسل کی مساعی اور ان کی دعوت حق ہی کا ثمرہ ہے۔ دنیا میں جو بھی مصلح اخلاق گزرا ہے اس نے داعیانِ حق ہی کی تعلیمات اخلاق سے خوشہ چینی کی ہے۔

اگر ہم انسان کی روحانی زندگی اور اخلاقی فضیلت کے تصور کو تسلیم کرتے ہیں تو ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم رسول کی رسالت پر ایمان لائیں اور یہ مان لیں کہ جس طرح اللہ نے انسان کی جسمانی ضرورتوں کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح روحانی ضرورت یعنی رشد و ہدایت کا بھی نظم فرمایا ہے، اور اس رحمت خداوندی سے کوئی قوم بھی محروم نہیں رہی ہے۔

تفریق بین الرسل

ان تمام نیک ترین انسانوں پر جن کو مذہب میں نبی اور رسول کہا جاتا ہے، ایمان لانا فرض ہے۔ یہ بھی اسلام کا ایک امتیازی وصف ہے کہ اس نے صداقت کے عالم گیر ہونے کا اعلان کیا، اور صرف اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اپنے ماننے والوں پر لازم کیا کہ وہ صداقت کے حاملین یعنی پیغمبروں پر بلاتفریق مذہب وملت ایمان لائیں۔ اس لیے کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے اور سب ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے نکلے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ: ۲۸۵)

رسول اس چیز پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس کے پاس بھیجی گئی ہے، اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ سب اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ان کا کہنا یہی ہے کہ) ہم رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید تفریق بین الرسل کا قائل نہیں ہے۔ وہ صاف طور پر کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو انبیاء ورسل بھی اس دنیا میں بھیجے گئے ہیں ان سب پر ایمان لانا ایک مومن صادق کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کا انکار کردیا جائے۔ قرآن مجید کے نزدیک وہ شخص مومن نہیں ہے جو کسی ایک نبی ورسول کی رسالت کا بھی منکر ہو، وہ ایسے شخص کو عذاب دردناک کی بشارت دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝ (بقرہ: ۱۵۰، ۱۵۱)

بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے

Marfat.com

رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم فلاں پر ایمان رکھتے ہیں اور فلاں پر نہیں، اور وہ ایک درمیانی راستہ نکالنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقت میں نرے کافر ہیں۔ اور کافروں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفریق بین الرسل صرف یہی نہیں ہے کہ آپ کسی رسول کی رسالت کا انکار کر دیں بلکہ یہ بھی تفریق بین الرسل ہی ہے کہ آپ ایک کی تعلیم کو صحیح مانیں اور دوسرے کی تعلیم کو رد کر دیں۔ ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی اصولی تعلیمات کو درست تسلیم کرے کیوں کہ انبیاء و رسل کی اصولی تعلیمات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان اصولی تعلیمات کو قرآن مجید نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ ہم ان کی روشنی میں دوسرے انبیاء و رسل کی بنیادی تعلیمات کا سراغ آسانی کے ساتھ لگا سکتے ہیں۔

ایک نبی کی حیثیت اور اُس کا فرض منصبی

ایک نبی اور رسول، خدا اور مخلوق کے درمیان واسطہ کا کام کرتا ہے۔ انسانوں کی ہدایت و اصلاح نیز اعمالِ خیر و شر کے عواقب سے ان کو خبردار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ملک و قوم کے صالح ترین افراد کو منتخب کیا اور ان کے ذریعہ اپنا پیغام ہدایت اپنے بندوں تک پہنچایا۔ انبیاء و رسل کا کام صرف الٰہی پیغامات ربانی کو ٹھیک ٹھیک بندوں تک پہنچا دینا تھا۔ جو لوگ اس پیغام کو قبول کر لیں انھیں نجات اُخروی اور سعادت ابدی کی بشارت دیں اور جو انکار و تمرد کی روش اختیار کریں انھیں تمرد و سرکشی کے نتائج سے ڈرا دیں، دوسرے لفظوں میں وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔

پیغام ربانی سے مراد وہ قانون زندگی اور ضابطۂ حیات ہے جس کی پیروی کر کے ایک انسان دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ قانون زندگی کیا ہے؟ قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ اسلام یعنی اطاعت کا قانون ہے، اور یہی دین فطرت بھی ہے۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم نے انسانوں کو اسی دین اسلام یعنی خدائے واحد کی اطاعت اور فرماں برداری اور اس کی پرستش کی دعوت دی، عیسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ قرآن مجید میں

Marfat.com

موجود ہیں :۔

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ، ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○

(زخرف - ۶۴)

اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی اطاعت و بندگی کرو - یہی سیدھی راہ ہے ۔

اسی پیغام کو انسانوں تک پہنچانے اور اس کے قبول و عدم قبول کے نتائج سے ان کو خبردار کرنے کے لیے تمام انبیاء مبعوث کیئے گئے تھے، کسی پیغمبر نے بھی یہ نہیں کہا کہ خدا کو چھوڑ کر اس کی اطاعت و بندگی کی جائے ۔

یہ ہے نبی کی حیثیت اور اس کا فرض منصبی - اس کے سوا ایک نبی اور رسول کی کوئی دوسری حیثیت نہیں ہے - قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے، کسی نہ کسی انسان کے گھر میں اور کسی نہ کسی انسان ہی کی صلب سے پیدا ہوئے، انسانوں ہی کی طرح فطری طریقے پر ان کی پرورش ہوئی، جوانی اور کہولت کی منزلیں طے کیں اور پھر موت کی نیند سو گئے - تمام بشری خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں - وہ بھی انسانوں ہی کی طرح سوتے اور جاگتے تھے، کھاتے اور پیتے تھے، بیوی اور بچے رکھتے تھے، خوشی کی بات سے خوش اور رنج دینے والی بات سے رنجیدہ و ملول ہوتے تھے، غرضیکہ تمام بشری اوصاف و خصائص سے متصف تھے، البتہ یہ تمام اوصاف و خصائص حدود اعتدال کے اندر تھے ۔

اس امر کی وضاحت سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ وہ بشر ہی تھے خدا نہ تھے، اور نہ بشر کے لباس میں خدا کا ظہور جسدی تھے جیسا کہ عیسائی، ہندو اور دوسری قومیں عقیدہ رکھتی ہیں - جب قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء بشر تھے تو اس سے مقصود اسی عقیدۂ باطل کی تردید ہوتی ہے ورنہ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ بشر تھے - یہ تو منکرین حق بھی تسلیم کرتے تھے بلکہ ان کے انکار و کفر کی ایک بڑی وجہ ان کا بشر ہونا ہی تھا چنانچہ وہ تعجب سے کہا کرتے تھے:

اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا (تغابن : ۶) کیا ایک بشر ہماری رہبری کرے گا۔

وہ بشریت اور رسالت کو دو متضاد چیزیں سمجھتے تھے - ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا

Marfat.com

اور انہی کی کیا بات ہے آج کے علمی دور میں بھی کتنوں کے دماغ میں یہ بات نہیں گھستی کہ بشریت اور رسالت میں کوئی تخالف نہیں ہے، ایک بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ بہر حال قرآن پاک نے جہاں بشریت انبیاء کا ذکر تاکیدی انداز میں کیا ہے اس سے اس کا مقصود مشرکین عالم کے اس عقیدۂ باطل کی تردید ہے کہ خدا خود انسانی لباس میں ظہور کرتا ہے۔

ایک سچے مومن کا عقیدہ یہی ہونا چاہئے کہ رسول بھی ایک انسان ہوتا ہے لیکن انتہائی بلند ترین انسان جس میں تمام ممکنہ اعلیٰ انسانی کمالات اور اوصاف پائے جاتے ہیں۔ وہ علم و عقل، فکر و نظر، فہم و فراست اور زہد و تقویٰ کا ایک ایسا کامل ترین نمونہ ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کامل اور بلند نمونہ کا تصوّر عقل انسانی نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن یہ سارے کمالات اور ساری عقلی و روحانی فضیلت بشریّت ہی کے دائرے میں ہوتی ہے۔ بشری حدود کمال سے باہر ان کا تصور کرنا دراصل ان کو بشریّت کے مقام سے اُٹھا کر اُلوہیت کے مقام پر فائز کر دینا ہے جو کھلا ہوا ظلم ہے۔

ہمارا ایمان ہر قسم کے غلوئے عقیدت سے پاک و صاف ہونا چاہیئے۔ ہم بشریّت کے حدود میں رہ کر اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی فضل و کمال کی نسبت ان کی طرف کریں، لیکن ان کو کسی ایسی صفت اور کمال سے متصف نہ کریں جو صرف خدا کی صفت کمال ہو مثلاً ہمہ بینی اور ہمہ دانی جسے مذہبی اصطلاح میں علم غیب کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کسی نبی اور رسول کی طرف نہ کریں، کیونکہ مطلق، ذاتی اور حقیقی علم غیب صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ یہ مقام نہ فرشتوں کو حاصل ہے اور نہ کسی نبی اور رسول کو جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل: ۶۵)

کہہ دو کہ خدا کے سوا زمین اور آسمان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو غیب کا علم رکھتا ہو۔

انبیاء کو اتنا ہی معلوم تھا جتنا کچھ اللہ نے اپنے خزانۂ غیب سے ان کو عطا فرما دیا تھا:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ: ۲۵۵) ایک دوسری جگہ فرمایا:-

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن: ۲۶، ۲۷)

وہ منتخب رسولوں کے سوا کسی دوسرے کو اپنے اُمور غیب کی خبر نہیں دیتا۔

ایک بشر کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ خدا اُسے

Marfat.com

اپنے اُمورِ غیب پر مطّلع کرنے کے لیے منتخب کرلے۔ خدا کے وہ بندے کتنے بختاور اور بلند اقبال تھے جن کو اللہ نے اس نوازش خاص کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ اللہ کے لطف وکرم کی تحقیر ہے کہ ہم اسے کم تر درجہ کی چیز سمجھ لیں، اور ہماری عقیدت کو تشفّی اسی وقت ملے جب ہم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو عالم الغیب قرار دے لیں۔ غلو کے عقیدت کے مرض سے دنیا کی کوئی قوم محفوظ نہیں ہے مگر افسوس کہ مسلمان جن کے پاس قرآن مجید جیسی بے نظیر کتاب موجود ہے وہ بھی اس مرض سے محفوظ نہ رہ سکے۔

نبی اور رسول کو عذاب وثواب اور نفع وضرر کا مالک بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر طرح کے نفع وضرر کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے کہ وہ مالکِ ارض وسما اور عالمِ غیب وشہادت ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تمام پیغمبروں نے خود اپنی زبان سے کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (اعراف: ۱۸۸)

کہہ دو کہ میں خود اپنے نفع اور نقصان کا مطلق اختیار نہیں رکھتا۔ سب کچھ اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔ اگر میں غیب کا علم رکھتا تو خیر کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچتا۔ میں تو صرف ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو بات مانیں۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے:

لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ (جن: ۲۱)

کہہ دو کہ میں نہ تو تمہارے لیے کسی ضرر کا کوئی اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا مرتبہ گرانے کے لیے نہیں کہی ہے بلکہ اس کا ذکر صرف اس لیے کر دیا ہے کہ انسان رسول اور نبی کو صرف اس کا پیغام رساں سمجھے، اور تنہا اسی کی ذات کو ہر خوف اور اُمید کا محور ومرکز قرار دے کہ ہر رسول کی بعثت کا یہی مقصد تھا۔ وہ زمین پر اللہ کا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ خود اپنے نام کا کلمہ بلند

Marfat.com

کریں، اور بندوں کے خوف اور اُمید کا محور و مرکز خود بن جائیں۔ ہر نبی نے یہی تعلیم دی کہ بخشش و عذاب، راحت و رنج، عزّت و ذلّت اور ملک و اقتدار کی کلید صرف خدا کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (آل عمران: ۲۶)

کہہ دو کہ اے اللہ مالک الملک تو ہی جس کو چاہتا ہے زمین کی بادشاہت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اسے چھین لیتا ہے۔ اور تو ہی جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر خیر کا سر رشتہ ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اطاعتِ رسول

خدا کے ساتھ اس کے رسول کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا:

قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(آل عمران: ۳۲)

کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر وہ اس بات سے روگردانی کریں تو اللہ ایسے منکرین (حق) کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

خدا کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو اس لیے لازم کیا گیا ہے کہ رسول، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان واسطہ کا کام کرتا ہے یعنی اس کے احکام و ہدایات کو اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ اس لیے جو شخص خدا کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے رسول کی اطاعت کرے۔ رسول کو رسول ماننا اور اس کی اطاعت سے روگردانی کرنا دراصل خدا کی اطاعت سے روگردانی کرنا ہے، اور ایسا کر کے کوئی شخص مومن

Marfat.com

نہیں ہو سکتا۔

احادیث رسول

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جس قول کی نسبت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے وہ حدیث ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ آپ اللہ کے رسول بھی تھے اور بشر بھی، اس لیے آپ کا ہر قول حدیث کا درجہ نہیں رکھتا۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے جب لوگوں نے حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:۔

> "میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا۔ لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں"۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے صرف وہی اقوال حدیث کا درجہ رکھتے ہیں جو توضیح احکام اور تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتے ہیں، خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اسی حقیقت کا ترجمان ہے:

اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر[2]	جب میں تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے لے لو، اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو (یہ سمجھو کہ) میں بھی ایک آدمی ہوں۔

احادیث دراصل قرآن پاک کی شرح و تفصیل یا دوسرے لفظوں میں منشار ربانی

---

[1] سیرت النبی جلد چہارم صفحہ ۸۸ (علامہ سید سلیمان ندوی) [2] مسلم، رواہ رافع بن خدیج، فضائل صفحہ ۱۲۰

Marfat.com

کی وضاحت ہیں۔ ایک رسول کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ مجرّد کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دے بلکہ یہ بھی فریضۂ رسالت ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کے حقیقی مفہوم و منشاء کی تشریح و توضیح بھی کر دے تاکہ اختلافِ عمل واقع نہ ہو۔

کسی کلام کے مخفی گوشوں کو نمایاں کرنے اور اس کے حقیقی مفہوم کے تعین کا حق صرف قائل کلام کو ہے، یہ حق کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ قرآن مجید رسول پر نازل ہوا اور آپ ہی کے توسط سے یہ دنیا کو ملا، اس لیے کلامِ ربانی کے حقیقی منشاء و مفہوم کی تشریح و توضیح کا حق صرف رسول کو حاصل ہے۔ آج کوئی شخص اس بات کے لیے مجاز نہیں کہ وہ تشریحات رسول سے ہٹ کر قرآن کی کوئی دوسری تشریح کرے۔ اگر رسول نے کہہ دیا ہے کہ صلوٰۃ کا مطلب ایک مخصوص بدنی عبادت یعنی نماز ہے تو اب ساری دنیا مل کر بھی صلوٰۃ کا کوئی دوسرا مفہوم متعین نہیں کر سکتی۔ یہی صورت دوسرے تمام احکام اور ہدایت ربانی کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر تشریحات کا تعلق قوانین و احکام اور روح احکام سے ہے جسے قرآن مجید میں کتاب اور حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ان تشریحات یعنی احادیث کی صحت کی دلیل کیا ہے؟ یعنی یہ ہم کیسے مان لیں کہ آج جو باتیں اقوالِ رسول کہہ کر پیش کی جا رہی ہیں وہ فی الواقع اقوال رسول ہی ہیں، اور ان میں کوئی حذف و اضافہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اکثر احادیث لفظاً نہیں معناً روایت ہوئی ہیں۔ معانی کی صحت کا دار و مدار قائل کے الفاظ کی صحت پر ہوتا ہے۔ جب الفاظ ہی محفوظ نہ رہے تو پھر بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ منشاء قائل یہی تھا۔

اعتراض وقیع ہے، لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی قرآن کی عملی شرح و تفسیر تھی[1] تو پھر آج ہم آسانی کے ساتھ یہ جان سکتے ہیں کہ کون سا قول، قولِ

---

[1] ایک بار چند صحابہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس گئے اور پوچھا: آنحضورؐ کا خلق کیسا تھا؟ آپ نے جواباً پوچھا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد آپ نے یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا: ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن (ابوداؤد، باب الصلوۃ) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

رسول ہے اور کون سا نہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کوئی قول ایسا ہے جو قرآنی تعلیمات سے ماخوذ یا اس کے کسی پہلو کی تفسیر و تشریح نہیں ہے یا وہ قرآن کی اصولی تعلیمات کے خلاف ہے تو ایسا قول، قولِ رسول نہیں ہو سکتا اور وہ اس قابل ہے کہ اسے رد کر دیا جائے خواہ اس کی پشت پر قوی اسناد ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ہر وہ حدیث صحیح اور قابلِ اتباع ہے جو متواتر المعنی ہو اور ساتھ ہی قرآن کی کسی اصولی تعلیم کے خلاف بھی نہ ہو بلکہ کسی نہ کسی پہلو سے اس کی شارح و مفسّر ہو۔ اگر مسلمانوں نے روزِ اول سے ان دو اصولوں کو تسلیم کر لیا ہوتا تو اُمّتِ مسلمہ نہ تو اختلافات کا شکار ہوتی اور نہ مذہب کے نام پر متعدد فرقے ہی وجود میں آتے۔

مجموعۂ احادیث

حدیث پر اصولی گفتگو کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کتبِ احادیث پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جو ہمارے یہاں قرآن کے بعد قوانینِ اسلامی کا دوسرے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

احادیث کا مجموعہ، متعدد کتب پر مشتمل ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دوسری اور تیسری صدی ہجری[1] کے مختلف ادوار میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی جن کتابوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ تعداد میں چھ ہیں: بخاری (مولف امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ) مسلم (مولف امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ) ابوداؤد (مولف امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ) ترمذی (مولف امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ) سنن نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) سنن ابن ماجہ (متوفی ۲۸۲ھ)

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق، قرآن تھا۔

حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آنحضورؐ کی پوری زندگی کا ایک ایک عمل قرآنی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔

[1] دوسری صدی ہجری کی پہلی کتاب موطا ہے۔ اس کے بعد حدیث کی جو دوسری کتابیں مرتب کی گئیں وہ تیسری اور بعض چوتھی صدی ہجری کی ہیں۔

Marfat.com

انہی چھ کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ امام مالک کی موطا اس میں شامل نہیں ہے حالانکہ یہ حدیث کی سب سے پہلی کتاب ہے اور ۵۰۰ احادیث پر مشتمل ہے۔ امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) نے اس کتاب کو تعامل اہل مدینہ کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ تمام اہل حدیث اس امر پر متفق ہیں کہ موطا کی تمام احادیث صحیح[1] ہیں۔ اس میں جو احادیث مرسل اور منقطع ہیں وہ بھی دیگر طرق سے متصل ہیں۔ امام شافعی موطا کے متعلق فرماتے ہیں:

"کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں سے زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی موطا ہے[2]"۔

عام طور پر بخاری اور مسلم کا درجہ سب سے بلند تسلیم کیا جاتا ہے اور انھیں صحیحین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تمام محدثین متفق ہیں کہ ان دونوں کتابوں کی تمام متصل مرفوع احادیث صحیح ہیں، اور یہ دونوں کتابیں اپنے مولفین تک بالتواتر پہنچتی ہیں۔

محدثین کی اس رائے اور تحقیق کے باوجود یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ کیا حدیث کی ان کتابوں میں مندرج تمام روایات صحیح اور درست ہیں، اور کیا ان کو نقد و نظر کی کسوٹی پر اب مزید پرکھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟

ہمارے یہاں غور و فکر کا عام انداز یہی ہے کہ ان کتابوں میں مندرج تمام حدیثیں صحیح اور درست ہیں اور ان کی حیثیت اور عظمت مسلّم اور تنقید سے بالاتر ہے، اسی لیے تو احادیث کو وحی غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے تمام عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں کتب احادیث کو نہایت اہم مقام حاصل ہے، اور دوران تعلیم انہی کتابوں پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے، اور ان کا درس بڑے اہتمام سے دیا جاتا ہے جسے دورہ حدیث کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل قرآن کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ اس کی تعلیم بس جلالین اور بیضاوی تک محدود ہے۔ صحیح بات یہ کہ ہمارے مدارس کے علماء تدبر فی القرآن سے زیادہ

---

[1] یہاں صحیح سے لغوی مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ یہ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب حدیث کی وہ قسم ہے جس کی سند راوی سے لے کر آنحضرت تک متصل ہو، درمیان میں کوئی راوی چھوٹ نہ گیا ہو، اور اس کے سب راوی صادق اور پختہ حافظہ رکھتے ہوں۔

[2] موطا لامام مالک و شرحہ، تنویر الحوالک۔ تالیف، امام جلال الدین سیوطیؒ، جلد اول ص ۶

Marfat.com

تدبر فی الاحادیث کرتے ہیں، اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن قرآن مجید، جو دین کی اولین بنیاد ہے، اس سے غفلت کے لیے بھی کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

آج امت کا ایک بڑا طبقہ احادیث کو قرآن ہی کی طرح صحیح اور ہر نقص سے پاک سمجھتا ہے، اور اس کے خلاف ایک لفظ سننا بھی خلاف ایمان سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر سراسر غلط اور بالکل بے بنیاد ہے۔ آج بھی کتب حدیث میں ایسی متعدد احادیث موجود ہیں جو روایت اور درایت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتیں، اور بعض ایسی بھی ہیں جو اسناد کے اعتبار سے تو صحیح ہیں لیکن قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

میری ان گزارشات کا یہ مفہوم بالکل نہیں ہے کہ ان احادیث کی بنیاد پر ہم سارے ہی ذخیرۂ احادیث کو غرق مے ناب کر دیں جیسا کہ منکرین حدیث کرتے ہیں، بلکہ اس سلسلے میں صحیح طرز فکر و عمل جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ ہے کہ ہم متواتر المعنی احادیث پر اپنے قول و عمل کی بنیاد رکھیں کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہر دور میں کثیر انسانوں نے ایک جھوٹ پر اتفاق کر لیا ہو۔ تواتر روایت خود دلیل صحت ہے بشرطیکہ یہ قرآن کی کسی نص صریح سے متعارض نہ ہو۔ مستفیض[1] احادیث کی یہی حیثیت ہے۔ ان کے علاوہ جو غیر متواتر احادیث ہیں اور جن کی تعداد کافی ہے، ان کو صرف اس لیے درست تسلیم نہ کر لیا جائے کہ وہ مجموعۂ احادیث میں شامل ہیں۔ ان کو از سر نو روایت اور درایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور پھر قرآن کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے، اور پھر ان کی صحت اور عدم صحت کا حکم لگایا جائے۔ ایسی تمام احادیث کو عمل کی بنیاد نہ بنایا جائے جو روایت اور درایت کے مسلّمہ اصولوں پر پوری نہ اترتی ہوں یعنی جو ضعیف، منقطع یا مغلوب السند یا مغلوب المتن یا مجہول الحال لوگوں سے مروی ہوں یا قرآن کی کسی نص کے خلاف ہوں۔

یہ کوئی کار بدعت نہ ہوگا۔ یہ کام تو تمام جامعین احادیث اپنی اپنی زندگی میں کرتے رہے ہیں، لیکن بعد کے ادوار میں یہ سلسلۂ نقد و نظر بند ہو گیا اور ہم نے سارے ذخیرۂ احادیث کو منزّل من اللہ قرار دے کر ان سب کو صحیح تسلیم کر لیا۔ روایت بالمعنی میں غلطیوں کا امکان

---

[1] مستفیض وہ احادیث کہلاتی ہیں جن کو تین یا اس سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہو۔

Marfat.com

بہرصورت موجود ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ذخیرۂ احادیث کا از سرِ نو علمی جائزہ لیا جائے تاکہ احادیث کی صحت ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو جائے اور منکرین احادیث کو کسی فتنہ پردازی کی کوئی معقول بنیاد نہ مل سکے۔

سُنّتِ رسول

جیساکہ ہم بیان کرچکے ہیں، حدیث قرآن مجید کی قولی تشریح کا نام ہے اور اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے جس میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، مواعظ و نصائح اور اخبارِ معاد وغیرہ سب ہی شامل ہیں، اور سنّت قرآن مجید کی فعلی تشریح کا نام ہے اور اس کا دائرہ محدود ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید اصولِ احکام کی کتاب ہے اور سنّت ان اصولی احکام کی عملی تشریح و توضیح ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ یہ عبادت کے دو اصولی احکام ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح کرکے اس کی عملی شکل و صورت متعیّن کی اور یہی سنّت ہے، اسی پر قرآن کے دوسرے تمام اصولی احکام کو قیاس کرنا چاہیے۔ امام شاطبی فرماتے ہیں:

فكانت السنة بمنزلة التفسير	سنّت دراصل احکامِ کتاب کے معانی کی
والشرح لمعاني احكام الكتٰب	شرح و تفسیر ہے۔

(الموافقات ج ۴ ص ۱۰)

سنّت کا وہ محدود مفہوم کسی طرح صحیح نہیں ہے جو آج کل دینی حلقوں میں سمجھا جاتا ہے[1]۔ ہم یہاں تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے صرف چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

---

[1] ہمارے یہاں دین دار لوگ سنّت سے صرف ظاہری شکل و صورت اور بعض ثانوی اعمالِ عبادت ہی مراد لیتے ہیں اور انہی کو دین و تقویٰ کی علامت سمجھتے ہیں۔ سنت کے اس سطحی مفہوم کی ترویج میں ہمارے علماء کرام کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی سنّتوں کو یکسر فراموش کردیا ہے۔ آج کون عالمِ دین ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح سادہ لباس پہنتا ہو، سادہ غذا کھاتا ہو، معمولی مکان میں رہتا ہو۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اعمال جن کا تعلق معاشرتی امور سے ہے مثلاً اشیائے خورد و نوش، ظروف، فرش، لباس، مکان اور سواری وغیرہ، ان میں سے کسی چیز کو بھی حقیقی معنوں میں سنّت کا رتبہ حاصل نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق ملکی عادات اور مقامی تمدن سے ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جداگانہ معاشرت کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ اس وقت جو مقامی عربی معاشرت رائج تھی اسی کو بعض ضروری اصلاحات کے بعد اختیار کر لیا مثلاً جو لباس ایک مومن عرب کا تھا وہی کافر کا بھی تھا اس میں فرق صرف اس قدر تھا کہ مومن کے لباس میں

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتا ہو، بکریاں خود دوہ لیتا ہو، پڑوسیوں کی خبرگیری کرتا ہو، ان کا سودا سلف بازار سے لا دیتا ہو، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہو، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی دامے درمے سخنے مدد کرتا ہو، حق گو اور راست باز ہو، کسی حال میں بھی خدا کے سوا کسی انسان سے نہ ڈرتا ہو، حق کا کلمہ بلند کرنے والا ہو، اور منکرات کو مٹانے کے لیے گلی گلی، اور شہر شہر دوڑتا پھرتا ہو اور لعلك باخع نفسك الا یکونوا مومنین کی تصویر ہو۔ جھوٹ نہ بولتا ہو، غیبت نہ کرتا ہو، عیب چینی اور عیب جوئی نہ کرتا ہو، بہتان طرازی سے پرہیز کرتا ہو، اور غرور و تکبر میں مبتلا نہ ہو۔ اسوۂ رسول تو خیر بڑی چیز ہے اسوۂ صحابہ ہی پر عمل پیرا ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح اس دارِ فانی سے کوچ کرے تو اس کے گھر میں تجہیز و تکفین کے لیے نقد رقم موجود نہ ہو، فاروق اعظمؓ کی طرح جن کے قدموں پر روم و ایران کی دولت کا ڈھیر لگا رہتا تھا، پیوند لگا کپڑا پہنتا ہو، غریبوں کے گھروں پر غلّہ اپنی پشت پر لاد کر لے جاتا ہو، جس کے خوفِ خدا کا یہ عالم ہو کہ تنکا اٹھا کر کہے کہ کاش میں تنکا ہوتا تو روزِ آخرت محاسبہ سے بچ جاتا۔ جس کے انکسار اور ضبط و تحمل کا یہ عالم ہو کہ ایک بڑھیا بھی برسرِ منبر ٹوک دے تو پیشانی پر بل نہ آئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا ترس علما ناپید ہیں۔ اللہ کے نیک بندے ہر دور میں رہے ہیں آج بھی ہیں اور تا قیامت رہیں گے۔ خدا کے ان نیک بندوں کو مستثنیٰ کر کے دیکھیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ آج بالعموم علمائے کرام اور شیوخ عظام کی زندگیاں آں حضورؐ اور آپ کے مقتدر اصحاب کے اسوہ سے بڑی حد تک ہٹی ہوئی ہیں۔ اس قسم کی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے جن پر یہ آیت صادق آتی ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (بقرہ: ۴۴)

"کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو درآنحالیکہ تم کتاب (الٰہی) کو پڑھتے ہو۔ کیا تم ذرا بھی سمجھ نہیں رکھتے؟"

Marfat.com

ستر پوشی، سادگی اور انکسار کا رنگ غالب تھا۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوتا ہے کہ ہر قوم کے شرفا، کا قومی لباس اسلامی لباس ہے بشرطیکہ اس میں ستر پوشی کا خیال رکھا گیا ہو، اور اس سے فخر و غرور اور تشابہ مرد و زن کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح جو کھانا ایک مومن عرب کھاتا تھا وہی کافر بھی کھاتا تھا فرق صرف حرام اور حلال کا تھا یعنی مومن کی غذا اور کسب غذا کے ذرائع دونوں ہی حرام عنصر سے پاک تھے۔ یہی حال دیگر معاشرتی امور کا بھی ہے۔

معاشرتی امور کے علاوہ بعض دوسرے دنیاوی معاملات کا بھی سنّت سے اصلاً کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً زراعت، تجارت، ذرائع حمل ونقل، آلات حرب اور طریق معالجہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں ایک مومن کو ہر دور کے مفید تجرباتی طریقوں کو اختیار کرنے میں پس وپیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جنگ عظیم اوّل میں علماء ترکی نے ترک فوجوں کے لیے بندوق کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اسی طرح خود ہندوستان میں ہمارے بعض علماء نے مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دے دیا تھا۔ سنّت نبوی کے حقیقی مفہوم کی وضاحت کے لیے ہم یہاں دور نبوی کے ایک واقعہ کا ذکر کریں گے۔

مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھواروں کے پھول مادہ چھواروں کے درختوں پر ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو ایک رسمی بات سمجھ کر فرمایا "اگر ایسا نہ کرو، تو اچھا ہوگا" اہل مدینہ نے آپ کا یہ ارشاد سن کر اس سال یہ ترکیب نہیں استعمال کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی۔ لوگوں نے جب اس کی خبر دی، تو آپ نے فرمایا: میں نے ایسا خیال کیا تھا، انتم اعلم باموردنیاکم "تم اپنے دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو"[1]

اس تاریخی واقعہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال و افعال جن کا تعلق عقائد، اعمال اور اخلاق کے بجائے دنیوی امور سے ہو، ان کو ہر دور

---

[1] صحیح مسلم۔ اس پر امام نووی نے یہ عنوان باندھا ہے۔ باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكره صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الرائ۔

میں جوں کا توں واجب العمل سنت قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ مستقل اور غیر متبدل وہی سنت ہے جو قرآن کے کسی اصولی حکم پر مبنی ہو۔

وہ متشرع لوگ جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو سنت قرار دے کر ان پر عمل کی تلقین کرتے ہیں لیکن حقیقی سنتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں، وہ اپنے اس رویّے سے وہی بات یاد دلاتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودی احبار کے متعلق فرمائی ہے۔ یہودی علماء نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ ان کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھاتے ہیں اور یہ بزرگوں کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"تم اپنی روایت سے خدا کا حکم کیوں ٹال دیتے ہو؟ ○ کیونکہ خدا نے فرمایا ہے تو اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر، اور جو ماں یا باپ کو برا کہے وہ ضرور جان سے مارا جائے ○ مگر تم کہتے ہو کہ جو کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جس چیز کا تجھے مجھ سے فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ خدا کی نذر ہو چکی ○ تو وہ اپنے ماں باپ کی عزت نہ کرے۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کا کلام باطل کر دیا ○ اے ریاکارو، یسعیاہ نبی نے تمہارے حق میں کیا خوب نبوت کی ہے:

یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے
مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے ○
اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیوں کہ یہ انسانی احکام کی تعلیم دیتے ہیں ○

پھر اس نے لوگوں کو پاس بلا کر کہا کہ سنو اور سمجھو ○ جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہ آدمی کو ناپاک کرتی ہے○ اس پر شاگردوں نے اس کے پاس آ کر کہا: کیا تو جانتا ہے کہ فریسیوں نے یہ بات سن کر ٹھوکر کھائی ○ اس نے جواب میں کہا: جو پودا میرے آسمانی باپ نے نہیں لگایا ہے جڑ سے اکھاڑا جائے گا○ انہیں چھوڑ دو ○ وہ اندھے

Marfat.com

راہ بتانے والے ہیں، اور اگر اندھے کو اندھا راہ بتائے گا تو دونوں گڑھے میں گریں گے ○ پطرس نے جواب میں اس سے کہا یہ تمثیل ہمیں سمجھا دے۔ اس نے کہا کیا تم بھی اب تک بے سمجھ ہو؟ کیا نہیں سمجھتے کہ جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا ہے اور مزبلہ میں پھینکا جاتا ہے ○ مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں ○ کیوں کہ برے خیال، خوں ریزیاں، زنا کاریاں، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں مگر ہاتھ دھوئے بغیر کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا۔"[۱]

کتابوں پر ایمان

جس طرح ہم تمام انبیاء و رسل پر یکساں ایمان رکھتے ہیں اسی طرح جو کتابیں وہ لے کر آئے ان پر بھی ہم یکساں طور پر ایمان رکھتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تمام کتابیں خدا کی طرف سے مختلف عہد کے انسانوں کی فکری و عملی ہدایت کے لیے نازل ہوئی تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (بقرہ:۱۳۶)

کہہ دو کہ ہم تو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر اتری ہے، اور اس پر جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل کی گئی تھی اور اس پر بھی جو عیسیٰ و موسیٰ اور دیگر انبیاء کو دی گئی تھی۔ ہم ان پیغمبروں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور

---

[۱] متی باب ۱۵: ۳ تا ۲۰

Marfat.com

ہم اللہ کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

تمام مذہبی کتابوں اور تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان رکھ کر ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ خدا کا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، اور تمام داعیانِ حق ایک ہی دین کے علم بردار تھے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ (شوریٰ: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا، اور جسے ہم نے بذریعۂ وحی تمہاری طرف بھی بھیجا ہے، اور ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اسی کا حکم دیا تھا (اور کہہ دیا تھا کہ اس) دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی حیثیت سے تمام ادیان درحقیقت ایک ہی اصل پر مبنی ہیں، اور ہر قوم کے پیغمبر ایک ہی دین یعنی دینِ قیّم کی طرف بلانے والے تھے یہ دینِ قیّم کیا تھا؟

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڏ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (بینہ: ۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں طاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی سیدھا دین ہے۔

ہم تمام مذہبی کتابوں پر ایمان رکھ کر دراصل اسی دینِ قیّم کی تصدیق کرتے ہیں جو تمام پیغمبروں کا متفق علیہ دین ہے۔

ایمان بالکتب کے تقاضے

آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے کا صرف اتنا ہی مفہوم نہیں ہے کہ آپ ان کو منزل من اللہ اور صداقت کا حامل سمجھ لیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے زمانے کے لیے جس

کتاب کو نازل فرمایا گیا ہے آپ اس کی تعلیمات پر بھی عمل کریں۔ اگر آپ ان میں بیان کردہ احکام خداوندی پر عمل نہیں کرتے ہیں تو آپ حقیقی معنی میں مومن نہیں ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَآ أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ۝ (مائدہ: ۴۳)

اور وہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جب کہ اس میں (توریت) خدا کا حکم موجود ہے۔ پھر بھی وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ فی الواقع مومن نہیں ہیں۔

آگے چل کر فرماتا ہے کہ ایسے لوگ فی الواقع منکر حق ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ۝ (مائدہ: ۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی منکر حق ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۝ (مائدہ: ۴۵)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ دراصل ظالم ہیں۔

مذکورہ آخری دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر یعنی منکر حق بھی ہے اور ظالم بھی۔ کافر تو اس لیے کہ وہ خدا کے قانون کو صحیح یا واجب العمل تسلیم نہیں کرتا، اور ظالم اس لیے کہ خدا کا قانون تو عدل و انصاف پر مبنی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ نہ صرف اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے تو خدا کے قانون کو تسلیم کرتا ہے لیکن خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو کر اپنے معاملات کا فیصلہ خدا کے قانون کے بجائے کسی دوسرے قانون کے مطابق کرتا ہے تو ایسا شخص فاسق یعنی گنہگار ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل انجیل کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيهِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ۝ (مائدہ: ۴۷)

اہل انجیل کو چاہیے کہ وہ انجیل میں خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

Marfat.com

کون کہہ سکتا ہے کہ ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے اس کے مخاطب صرف اہل کتاب ہیں۔ ایسا سمجھنا صریح خود فریبی ہوگی۔ اگر کسی فعل کا ارتکاب اہلِ کتاب کو مجرم قرار دے سکتا ہے تو پھر اگر کوئی مسلمان اسی فعل کا ارتکاب کرے تو وہ کیوں نہ مجرم قرار پائے، خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے کسی نے کہا کہ یہ تین آیتیں تو بنی اسرائیل کے حق میں ہیں یعنی اگر بنی اسرائیل کا کوئی شخص خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اس کے جواب میں حضرت حذیفہؓ نے فرمایا:

نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل	کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل
ان کانت لھم کل مرۃ ولکم	کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لیے اور میٹھا میٹھا سب
کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن	تمہارے لیے۔ ہرگز نہیں، خدا کی قسم تم بھی انھیں
طریقھم قدر الشراک[1]	کے راستے پر قدم بقدم چلو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس میں بیان کردہ احکام کو بھی تسلیم کرے اور حتیٰ الوسع خدا کے قانون کے مطابق اپنے معاملات زندگی کا فیصلہ کرے۔ حتیٰ الوسع کی بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ انسان اپنی واقعی استطاعت کی حد تک ہی مکلّف ہے۔ اور یہ واقعی استطاعت غیر اسلامی ریاستوں میں خصوصیت کے ساتھ متاثر ہو رہی ہے۔ مثلاً مقدمے کا ایک فریق تو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ چاہتا ہے لیکن فریق ثانی اس کے لیے تیار نہیں ہے، وہ ملکی قانون کے مطابق فیصلہ چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں فریق اوّل یا تو اپنے حق سے دست بردار ہو جائے، اور یا غیر اسلامی عدالت میں اپنے حق کے دفاع کے لیے جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخصوص حالات میں بدرجۂ مجبوری صرف اپنے حق کے دفاع کے لیے ایک شخص غیر اسلامی قانون کو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ تو خدا کے قانون کے مطابق فیصلہ چاہے لیکن فریق ثانی اس کے لیے تیار نہ ہو اور حکومت غیر اسلامی ہو۔

---

[1] تفہیم القرآن جلد اوّل سورۂ مائدہ حاشیہ نمبر ۷

Marfat.com

جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کتاب کی تلاوت کرے اور ٹھیک ٹھیک تلاوت کرے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۚ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (بقرہ: ۱۲۱)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کتاب کی تلاوت کرتے رہتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے۔ یہی لوگ درحقیقت کتاب پر سچا ایمان رکھتے ہیں۔

ٹھیک ٹھیک تلاوت کتاب کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوازم آداب کے ساتھ اسے پڑھا جائے، اور اس کے ہر امر و نہی پر عمل کیا جائے اگر کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کے باوجود اس کے اوامر و نواہی کی پروا نہیں کرتا ہے تو اس تلاوت سے کوئی فائدہ نہیں، اور اللہ کی کتاب پر اس کا ایمان صرف زبانی ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی حق تلاوت ادا نہیں کرتا جو اوامر و نواہی پر عمل تو درکنار اس کے معنی و مفہوم سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ یہ دونوں باتیں حقیقی ایمان کے منافی ہیں۔ جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے اوامر و نواہی کو بھی جانتا ہے لیکن ان پر عمل نہیں کرتا، وہ فاسق ہے، اور جو شخص قرآن پاک کی تلاوت کے باوجود اس کے اوامر و نواہی کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا وہ غیر شعوری طور پر قرآن کی بے قدری کرتا ہے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ تلاوت سے اس کا مقصود تطہیر قلب اور تہذیب اعمال نہیں بلکہ محض حصول ثواب ہے۔ ہر تلاوت کرنے والے کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نبی اُمّی کی بعثت کا مقصد تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ تزکیۂ باطن بھی تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ: ۲)

اسی نے ناخواندہ لوگوں میں خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

Marfat.com

آخرت پر ایمان

قرآن مجید نے واشگاف انداز میں اس حقیقت کا اظہار متعدد مقامات پر کیا ہے کہ ایک دن اس وسیع و عریض عالم مادی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم جداگانہ خصوصیات کے ساتھ معرض وجود میں آئے گا۔ اور اسی کے مطابق اس کو جزا یا سزا ملے گی۔ اسی دن کا نام اس کی اصطلاح میں یوم آخرت یا یوم جزا (Day of Reward) ہے۔

قرآن میں عقیدۂ توحید کے بعد جس عقیدہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ عقیدۂ آخرت ہے۔ کیونکہ تنہا یہی عقیدہ یعنی پرسش اعمال کا تصور، ایک انسان کو ہمہ وقت اس کے اعمال کا نگران بناتا ہے۔ اور اس کو نفس کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور اس کے قلب و ذہن کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور انسانی معاشرے کو ایثار و ہمدردی، غمخواری و غم گساری جود و سخا، رافت و رحمت، عدل و قسط، دیانت و امانت اور صداقت و حق گوئی کی جوہری صفات عطا کر کے اس کی بنیادوں کو مستحکم بناتا ہے۔ گویا اصلاح معاشرہ اور انسانوں میں مثالی کردار پیدا کرنے کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ عقیدۂ آخرت کا صحیح تصور ہی ہے اگر آپ اس عقیدے کو انسانی زندگی سے نکال دیں تو پھر فسادِ معاشرہ اور فسادِ اخلاق دونوں کا وقوع ناگزیر ہے۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں جب بھی انسانی زندگی پر اس عقیدے کی گرفت ڈھیلی ہوئی ہے۔ انسانی معاشرہ ظلم و عدوان، خویش نوازی و اقربا پروری، خود غرضی و خود پرستی، سنگدلی و بے مروتی، عیش کوشی و نفس پرستی، خیانت و بددیانتی، دجل و فریب اور ایسے ہی سیکڑوں اعمال و اخلاقِ بد کی خرابیوں سے آلودہ ہونے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ عقیدۂ آخرت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے۔

روزِ جزا کا مفہوم

قرآن حکیم نے آخرت کے لیے ایک لفظ یوم الدین بھی استعمال کیا ہے جس کا مطلب

Marfat.com

روزِ جزا ہے۔ یہ لفظ خود آخرت کی حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ سورہ فاتحہ جو نماز کا جزوِ لازم ہے۔ اس میں یہ لفظ مالکِ یوم الدّین کی شکل میں موجود ہے۔ سورہ فاتحہ میں خدا کی جن تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ترتیب کے اعتبار سے یہ تیسری صفت ہے۔ پہلی دو صفتیں ربوبیت اور رحمت ہیں۔ یہ تینوں صفتیں لازم و ملزوم ہیں۔ ربوبیت کے بغیر رحمت کا اور رحمت کے بغیر ربوبیت کا تصور محال ہے، اور ان دونوں کا ناگزیر نتیجہ تصورِ عدالت ہے۔ اگر آپ ان میں سے ایک صفت کو بھی نکال دیں تو پھر دوسری صفتوں کا کوئی حقیقی تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساری کائنات خدا کی انھیں تین عظیم صفتوں پر قائم ہے۔

ہم جیسے ہی مالکِ یوم الدین کہتے ہیں، ہماری نگاہ کے سامنے ایک عادل حکمراں ہستی کا تصور پھر جاتا ہے جو اپنی رعیّت کی ضروریات کا کفیل اور اس کے حال پر حد درجہ مہربان ہے۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کی رعیت اس کی ربوبیت اور رحمت سے فیض یاب ہونے کے بعد کیا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے یعنی شاکرِ نعمت بنتی ہے یا کفرانِ نعمت کی مرتکب ہوتی ہے؟ اس عادل و رحیم ہستی نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیج کر بندوں کو واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس کا کون سا عمل شکرِ نعمت کے درجہ میں آتا ہے اور کون سا عمل کفرانِ نعمت کے ہم معنی ہے۔ اور یہ کہ شکرِ نعمت سے وہ خوش اور کفرانِ نعمت سے ناراض ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے انسان کو اعمال کے نتائج سے باخبر کر دیا ہے اور یہ اس کی رحمت و ربوبیت کا عین اقتضا تھا۔

فی الواقع انسانی افعال کے نتائج کے ظہور کا نام ہی روزِ آخرت یا روزِ جزا ہے۔ جس طرح ہر عمل کا ایک ردِّ عمل ہے اور ناممکن ہے کہ عمل واقع ہو اور اس کا ردِّ عمل ظہور میں نہ آئے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ انسان سے کوئی فعل سرزد ہو اور اس فعل کے نتائج ظاہر نہ ہوں۔ کون نہیں جانتا کہ اشیائے غذائی اور پانی کا استعمال بقائے حیات کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ غذا اور پانی کا یہ لازمی خاصہ ہے۔ اسی طرح سنکھیا کا استعمال آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے کہ یہ اس کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ان چیزوں کو استعمال کرے اور اس کے اثرات و نتائج سے دوچار نہ ہو۔

مادّیات کی طرح معنویات کے بھی قوانین ہیں، چنانچہ روزِ آخرت اچھے افعال کا نتیجہ

Marfat.com

روحانی مسرت اور خوشنودیٔ رب کی صورت میں، اور برے افعال کا نتیجہ حزن وملال، روحانی کرب واضطراب، اور خدا کی ناخوشی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ایسا ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس دنیا میں برا عمل کرے اور روز آخرت اس کے نتیجۂ بد سے بچ جائے، اور کوئی شخص اچھا عمل کرے اور اس کے صالح نتائج اسے حاصل نہ ہوں۔ اس دنیا میں تو ممکن ہے کہ بعض حالات میں اس کے خلاف بھی ہو جائے، لیکن روز آخرت نتائج اعمال اپنی حقیقی صورتوں ہی میں ظاہر ہوں گے۔ ان حقائق کو قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (جاثیہ: ۲۱)

وہ لوگ جو برے کام کرتے رہتے ہیں، کیا انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے، ان کا جینا اور ان کا مرنا ایک ہی طرح کا ہوگا، یہ بڑا (عجیب اور) برا فیصلہ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (ص: ۲۸)

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان کے برابر کر دیں گے جو زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں، یا کیا ہم متقی کو فاجر کے برابر رکھیں گے؟

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ افعال کے نتائج یکساں نہیں ہو سکتے۔ یہی عقل کا فیصلہ ہے اور یہی عدل وانصاف کا تقاضا بھی ہے۔ یوم آخرت پر جو شخص یقین رکھتا ہے وہ اعمال کے نتائج پر بھی یقین رکھے۔ جو شخص نتائج اعمال کو تسلیم نہیں کرتا وہ فی الواقع روز جزا کے مفہوم سے واقف نہیں ہے اور اس ناواقفیت کا نتیجہ ایک دن اس کی ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ سنکھیا کھانے والا یہ کہہ کر سنکھیا کے نتائج سے نہیں بچ سکتا کہ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سنکھیا ایک مہلک شے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل کے

Marfat.com

ذریعہ ہم کو اعمال کے اثرات و نتائج سے آگاہ کر دیا ہے اس لیے روز آخرت اعمال کے نتائج کو دیکھ کر کوئی شخص کسی طرح کی کوئی معذرت پیش نہیں کر سکے گا، اور اس سے صاف کہہ دیا جائے گا:

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (جاثیہ: ۲۸)

جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو آج کے دن اس کا پورا پورا بدلہ پا رہے ہو۔

پھر وہاں معذرت کی گنجائش کہاں کہ اس کا پورا دفتر اعمال اس کے سامنے کھلا ہوگا:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۳، ۱۴)

ہم نے ہر انسان کی بھلائی برائی کو اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کے نامۂ اعمال کو اس کے سامنے نکال کر رکھ دیں گے جس کو وہ اپنے سامنے کھلی ہوئی کتاب کی صورت میں دیکھ لے گا۔ لے پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج کے دن تو خود اپنے محاسبہ کے لیے کافی ہے۔

اس دن تمام مجرم اپنے اعمال کے نتائج کو اصل صورت میں دیکھ کر آئینۂ حیرت بن جائیں گے اور تعجب سے کہیں گے:

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝ (کہف: ۴۹)

ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسا نامۂ اعمال ہے جس میں ہر چھوٹی اور بڑی بات قلم بند ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا وہ سب وہاں (لکھا ہوا) موجود پائیں گے۔ اور تمہارا رب کسی پر (ذرہ برابر بھی) ظلم نہیں کرتا۔

اور پھر عالم حسرت میں کہہ اٹھیں گے:

يٰحَسْرَتٰى عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (زمر: ۵۶)

افسوس ان کوتاہیوں پر جو ہم نے اللہ کے بارے میں کیں (اور آج ان کے نتائج بھگت رہے ہیں)

Marfat.com

نتائج اعمال سے غفلت کے اسباب

اس دنیا میں ایک انسان دو وجوہ سے نتائج اعمال سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ پہلی وجہ یہ نظریہ ہے کہ اس دنیا کے بعد کوئی دنیا نہیں ہے۔ یہ نظریہ بالعموم جدید فلاسفہ اور تعلیم یافتہ طبقے میں ملتا ہے جنھیں ہم اصطلاحاً ملاحدہ کہتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ خیال باطل ہے کہ روز آخرت اعمال کے نتائج سے کسی بزرگ، ولی اور پیغمبر کی سعی و سفارش سے بچا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے حامی جاہل عوام اور نفس پرست مذہبی پیشوا ہوتے ہیں۔ عقیدہ و عمل کی یہ گمراہی عالمگیر ہے، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب اس میں مبتلا ہیں۔ ہم سب سے پہلے الحادی ذہنیت رکھنے والے طبقے کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد دوسرے طبقہ کے خیالات کی غلطی کو آیات قرآنی کی روشنی میں واضح کریں گے۔

آخرت کے بارے میں ملحدین کا نقطۂ نظر

جو اہلِ علم صرف مادی زندگی کے قائل ہیں اور اس کے بعد کسی دوسری زندگی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیالات کی ترجمانی دورِ جدید کے مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل کی اس تحریر میں ملتی ہے:

> "انسان ایسے اسباب و علل کی پیداوار ہے جن کا پہلے سے سوچا سمجھا اور متعین کوئی مقصد نہیں۔ اس کا آغاز، اس کا نشوونما، اس کی اُمیدیں، اس کے اندیشے، اس کی محبت اور اس کے عقائد سب محض جوہروں کی اتفاقی ترتیب کا نتیجہ ہیں۔ کوئی تخیل، کوئی اولوالعزمی، کوئی عمیق خیال اور احساس آدمی کی زندگی کو قبر کے پرے قائم نہیں رکھ سکتا (یعنی قبر کے بعد کسی دوسری زندگی کا امکان خارج از قیاس ہے) صدیوں کی کوششیں جاں نثاریاں اور ریاضتیں، الہامی تخلیقات اور انسانی ذہانت کی تابناکیاں، یہ سب چیزیں نظامِ شمسی کی مکمل تباہی کے ساتھ یقینی طور پر فنا ہو جائیں گی،

Marfat.com

اور انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر تباہ شدہ کائنات کے ملبہ کے نیچے دفن ہو کر رہ جائے گا۔ یہ تمام امور اگرچہ اختلاف سے بالاتر نہیں، لیکن پھر بھی یقین سے اتنے قریب ہیں کہ جو فلسفہ بھی ان کا منکر ہو گا وہ دیر پا ثابت نہیں ہو سکتا۔[1]

یہ ہے انسانی زندگی کے انجام کے متعلق ایک عظیم فلسفی کا نقطۂ نظر۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی بات ہے، لیکن ذرا تحقیق سے کام لیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک نہایت ہی لچر بات ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اسے ایک شاعرانہ تخیّل قرار دیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ ثانی کے متعلق دورِ جدید کے اربابِ علم و خرد کی ساری کاوشیں دورِ قدیم کے کم علم انسانوں کی فکری کاوشوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کے بادیہ نشین بھی کہا کرتے تھے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں، اور حیات و مرگ کا یہ سلسلہ گردشِ زمانہ کا نتیجہ ہے، اس کے پیچھے کسی حکیم و علیم خالق کا دستِ قدرت کارفرما نہیں ہے۔ قرآن پاک نے ان کے اس خیال کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ: ۲۴)

اور (منکرینِ آخرت) کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیوی زندگی کے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جہاں ہم مرتے اور جیتے ہیں، اور صرف گردشِ زمانہ ہی ہماری موت کا سبب ہے۔

فی الواقع حیات بعد موت کے انکار کا تعلق کسی علمی تحقیق سے نہیں ہے۔ بلکہ ظن و گمان کی بنیاد پر ایسا کیا جاتا ہے، اور اس کے پس پردہ دراصل انسان کی نفس پرستی کام کرتی ہے۔ چونکہ زندگی بعد موت کا تصوّر انسان کی خواہشات نفس کو بے لگام نہیں ہونے دیتا اور اس کی بے شمار آرزوؤں کی تکمیل میں سدِّ راہ بنتا ہے اس لیے نفس پرست اربابِ علم و خرد اس پر یقین نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ جب انسان مٹی میں رل مل جائے گا تو پھر

---

[1] Limitationsof Science, J. W. N. Sullivan P. 133
Published by New American Library, New York 1959

دوبارہ کس طرح حیات نو کا قالب اختیار کرسکتا ہے؟ حیات ثانی کے انکار کی یہ دلیل کوئی نئی دلیل نہیں ہے۔ ہر دور میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسی کج فکری کا ثبوت دیا ہے۔ عرب کے کفار و مشرکین بھی اسی دلیل کا سہارا لیتے تھے اور کہتے تھے:

مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُوْنَ ﴿ (واقعہ: ۴۷)

جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں کے سوا کچھ نہ رہ جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

اثبات معاد

حیات بعد موت کا معاملہ اگرچہ اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں اس دنیا میں ناقابل مشاہدہ و تجربہ ہے تاہم اس عالم رنگ و بو کے بعض واقعات اور خود انسانی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جو حیات بعد موت کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی متعدد آیات میں ان واقعات و حقائق کی طرف انسانوں کی توجہ کو مبذول کرایا ہے۔ ہم انہی واقعات و حقائق کی روشنی میں حیات بعد موت کے اثباتی دلائل کا یہاں ذکر کریں گے تاکہ منکرین آخرت کے ذہنی شکوک کا ممکن حد تک ازالہ ہو سکے اور ساتھ ہی اہل ایمان کے قلوب و اذہان اطمینان و یقین کی روشنی سے منور ہو سکیں۔

۱۔ خلق اوّل

حیات بعد موت کے ثبوت میں قرآن مجید کی ایک اہم عقلی دلیل خلق اوّل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس ہستی نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا جب کہ وہ عدم محض تھا تو پھر وہی ہستی اسے دوبارہ زندہ اٹھا کھڑا کرے گی جب کہ وہ پیوند خاک ہو چکا ہو گا جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ (یٰسٓ ۷۸-۷۹)

(منکرین آخرت) کہتے ہیں کہ جب ہم بوسیدہ ہڈی ہو جائیں گے تو پھر ان ہڈیوں کو کون زندگی

عطا کرے گا؟ کہہ دو (اے محمدؐ) کہ وہی ہستی اسے زندگی دے گی جس نے اسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر ایک (طریقے) تخلیق کا بخوبی علم رکھتا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (بنی اسرائیل ۴۹-۵۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا تمہارے نزدیک اس سے بھی بڑی جو چیز ہو وہ تم بن جاؤ، تو وہ تم سے کہیں گے کہ کون ہم کو دوبارہ (پہلی حالت میں) لوٹائے گا۔ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس فعل کا وقوع مخصوص حالات میں ایک بار ہو سکتا ہے اسی فعل کا وقوع انھیں حالات میں دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے کوئی ہوش مند آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک سنگ تراش اپنے مخصوص علم کی بنا پر ایک سنگی مجسمہ بناتا ہے، کیا وہ دوسرا سنگی مجسمہ نہیں بنا سکتا یا پہلے مجسمہ کو توڑ پھوڑ کر اسی طرح کا دوسرا مجسمہ تیار نہیں کر سکتا؟ یقیناً کر سکتا ہے، تو پھر کیا خالق کائنات جس کے علم و حکمت اور اعجاز خلق پر اس عالم کا ذرہ ذرہ شاہد ہے، اور انسان جس کی صنعت گری کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے، انسان کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ ایسا بآسانی کر سکتا ہے۔ اگر ہم پہلی تخلیق کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر خلق ثانی کو بھی لازماً ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہاں جو لوگ سرے سے خلق اوّل کے منکر ہیں ان کے پاس انکار کی کوئی علمی و عقلی دلیل نہیں ہے، وہ بس وہم و گمان کے پیرو ہیں، ان کا مبلغ علم بس اتنا ہی ہے کہ جس چیز کو آنکھوں سے دیکھا اسے تسلیم کر لیا اور جسے آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اس کے منکر بن گئے۔ گویا کسی چیز کا وجود ان کے مشاہدۂ عینی پر منحصر ہے اور ان کے دائرۂ مشاہدہ سے باہر کسی حقیقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز استدلال مغالطہ آمیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہم و

Marfat.com

گمان انکارِ حق کی دلیل نہیں بن سکتا ہے:

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ
مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۝ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ڏ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ (النجم: ٣٠)

انھیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور ظن، حق کا قائم مقام نہیں بن سکتا ہے۔ پس جو شخص ہمارے ذکر سے منہ موڑ لے اس سے تم اعراض کرو۔ وہ صرف حیاتِ دنیوی کے طلب گار ہیں اور ان کا مبلغ علم بس اتنا ہی ہے۔

۲۔ آثارِ کائنات

حیات بعد موت کے اثبات میں قرآن پاک دوسری اہم دلیل آثارِ کائنات سے دیتا ہے۔ منکرینِ آخرت کے انکار کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انسان جب خاک میں مل کر نیست و نابود ہو جائے گا اور اس کے وجود کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا تو پھر اس کو دوبارہ زندہ کر دینا ناممکن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ کیا انسان نہیں دیکھتا کہ موسمِ گرما میں بے آب و گیاہ زمین جس پر کہیں بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے، بارش کے ایک ہی چھینٹے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ جس زمین پر ابھی چند منٹ پہلے تک خاک اڑتی تھی وہاں دیکھتے دیکھتے سبز گھاسوں کا مخملیں فرش بچھ جاتا ہے، اور خوشنما ہرے بھرے پودے ہر طرف لہلہانے لگتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ جس مردہ زمین میں بظاہر تمام اسبابِ حیات ناپید تھے اور کہیں ڈھونڈے سے بھی کوئی زندہ ارضی وجود رینگتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بارش کے ساتھ ہی دفعتہً اسی مردہ زمین کے آغوش میں مختلف النوع کیڑے کوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ حیات بعد موت کا ایک عینی ثبوت نہیں ہے؟ قرآن مجید نے اس اہم حقیقت کی طرف متعدد جگہوں پر اشارے کیے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ
فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ (فاطر: ۹)

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پس وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم انھیں مردہ زمین تک ہنکا کر لے جاتے ہیں۔ پس اس کے ذریعہ ہم اس مردہ زمین کو حیات نو عطا کرتے ہیں اسی طرح انسانوں کو بھی ایک دن دوبارہ اٹھنا ہوگا۔

دوسری جگہ آیا ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (روم: ۵۰)

اللہ کے آثار رحمت پر ایک نظر ڈالو۔ وہ مردہ زمین کو کس طرح نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہی مردوں کو بھی جلانے والا ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ زوجیت کا مقتضا

اس دلیل کی روشنی میں اگر آپ غور کیجئے تو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کا وجود بالکل یقینی معلوم ہوتا ہے، اتنا یقینی کہ اگر اس زندگی سے اس کے تصور کو نکال دیجئے تو ہماری موجودہ مادی زندگی کی تشریح و تعبیر ناممکن ہو جاتی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اس عالم مادی کی ہر شے زوجین (Pair) کی شکل میں خلق ہوئی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (ذاریات: ۴۹)

اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔

دوسری جگہ آیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یٰسین: ۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے پیدا کیے ہر قسم کے جوڑے نباتات زمین کی قسم میں سے اور خود ان کی یعنی انسان کی اپنی قسم میں سے، اور ان کی قسم میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

نگاہ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جوڑے کا ہر فرد دوسرے کا مد مقابل ہے لیکن

حیرت انگیز توافق و سازگاری سے وہ اپنی تخلیق کے مقاصد و مصالح کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ کائنات کے اندر فیضان و افادیت اور نفع بخشی کا جو رجحان پایا جاتا ہے وہ زوجین کے وجود اور ان کے باہمی توافق ہی کا نتیجہ ہے۔ زوجین کے ایک رکن کو بھی علیحدہ کر دیجئے تو یہ سلسلۂ فیضان و بخشش یک قلم منقطع ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زوجین کا ہر رکن بالذات ناقص اور نامکمل ہوتا ہے اور دوسرے رکن کے ساتھ مل کر ہی اپنے خلقی نقص و ناتمامی کی تلافی کرتا ہے اور پھر نافع بنتا ہے۔ مثال کے طور پر رات اور دن کو دیکھئے دونوں ایک دوسرے کی ضد اور مقابل وجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی نفع بخش اور بامقصد بنتا ہے۔ یہی حال مرد اور عورت کا ہے۔ زوجین کا ہر فرد ایک دوسرے سے انتہائی مختلف مگر اپنے وجود کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اس جوڑے کے ایک فرد کو بھی الگ کر دیں تو دوسرے کا وجود ناقص نامکمل اور بے مقصد بن جاتا ہے۔ یہی حال کائنات کی ہر چیز کا ہے۔ اگر یہ کائناتی حقیقت ہم تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس عالم مادی کے ساتھ ایک دوسری غیر مادی دنیا کا وجود ناگزیر ہے۔ اس دوسری دنیا کو تسلیم کیے بغیر ہماری موجودہ دنیا متعدد پہلوؤں سے ناقص، ناتمام اور بے مقصد نظر آتی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں :

> "جنھوں نے اس دنیا کی ہر چیز کو صرف اس کی اکہری حالت میں دیکھا ہے دہری حالت میں نہیں دیکھا ہے یعنی ان کی نگاہ جوڑے کے صرف ایک ہی فرد پر پڑی ہے۔ دوسرے فرد کو وہ نہیں دیکھ سکے ہیں، ان پر اس کائنات کا اصل حسن و جمال بے نقاب نہ ہو سکا اور اس کے سبب سے وہ طرح طرح کی غلطیوں میں پڑ گئے۔ جو شخص صرف اس دنیا کو دیکھے گا اور آخرت پر اس کی نگاہ نہ پڑے گی اس کے لیے یہ باور کرنا نہایت مشکل ہو گا کہ اس دنیا کی خالق کوئی ایسی ہستی ہے جو حکیم و رحیم ہے کیونکہ دنیا میں ظلم و معصیت کے جو وحشتناک مناظر ہیں وہ کسی طرح بھی اس کے دل کو اس بات پر جمنے نہیں دیں گے کہ اس دنیا کا خالق حکیم و رحیم ہے۔" (تفسیر سورہ الشمس ص۲۱)

Marfat.com

۴۔ عدل کامل کا تقاضا

آپ دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک آدمی تقویٰ و طہارت، دیانت و امانت، راست بازی و نیکوکاری اور عدالت و شرافت کی زندگی گزارتا ہے مگر اس کا کوئی صلہ نہیں پاتا بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسا شخص رنج و کلفت میں مبتلا رہتا ہے، اس کے برخلاف ایک دوسرا آدمی جو زندگی کے ہر معاملے میں ظلم و زیادتی، دجل و فریب اور بددیانتی اور معصیت کوشی کا مظاہرہ کرتا ہے، خوش و خرم اور کامیاب و بامراد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جرائم پیشہ افراد اکثر و بیشتر حالتوں میں اپنے گھناونے جرائم کی کوئی سزا نہیں پاتے۔ ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے اور قاتل کا سراغ لگانے میں حکومت کی مشینری ناکام رہتی ہے۔ اگر حسن اتفاق سے قاتل گرفتار بھی ہو جاتا ہے تو وہ کبھی اربابِ حل و عقد کو رشوت دے کر اور کبھی واقعۂ قتل کے عینی شاہدوں کو ڈرا دھمکا کر قتل کے سنگین نتائج سے صاف بچ نکلتا ہے، اور اگر کبھی اسے قید و بند کی سزا ملی بھی تو یہی پانچ دس سال کے لیے۔ قتل جیسے سنگین جرم کی یہ سزا بالکل ناکافی ہے یہی حال دوسرے جرائم کا ہے۔

اس کے علاوہ اس دنیا میں کسی بھی جرم کی مکمل سزا ملنی ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر کسی آدمی نے دس آدمیوں کو قتل کر دیا آپ اس کے عوض میں اس کو جو سب سے زیادہ سزا دے سکتے ہیں وہ یہی کہ اس کو بھی قتل کر دیں، لیکن کیا یہ دس آدمیوں کے قتل کی سزا ہو گی؟ یہ تو صرف ایک آدمی کے قتل کی سزا ہوئی، باقی نو آدمیوں کے قتل کی سزا اسے کہاں ملی۔ اس کو جرم کی پوری سزا اسی وقت ملتی جب وہ بھی دس مرتبہ قتل کیا جاتا، اور یہ اس دنیا میں ناممکن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کا نظام عدالت، منصف اور حاکم سب ناقص ہیں اور اس ناقص نظام کے تحت حقیقی انصاف کے تقاضے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ اس عدل ناقص اور انسانی فطرت میں عدل کامل کی طلب صادق کے پیش نظر عقل یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیا کے علاوہ ایک دوسری دنیا بھی ہو جہاں کی عدالت کامل میں مظلوم کی دادرسی ہو اور ظالم کیفر کردار کو پہنچیں، بداطوار اپنی بداطواری کی سزا پائیں اور نیک اطوار اپنی نیک اطواری کا صلہ

Marfat.com

پائیں۔ اگر آپ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر یہ بھی تسلیم کریں کہ اس موجودہ دنیا میں نہ کبھی ظالم اور بدکردار کا سر نیچا ہو سکتا ہے، اور نہ ہی مظلوم کی دادرسی اور نیکوکار انسان کی اشک شوئی ممکن ہے۔

عقل انسانی ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ فی الواقع تخلیق کائنات کی حقیقی توجیہ اور عدل کامل کا ظہور اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم حیات بعد موت کے تصور کو قبول کرلیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ۝ (سورہ یونس: ۴)

بیشک وہی (اللہ) خلق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر وہی (ایک دن) اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ (اس دنیا میں) ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے، ان کو انصاف کے ساتھ پورا پورا بدلہ دے اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ان کے کفر کے بدلہ میں کھولتا ہوا پانی پینے کے لیے ملے گا اور (دوسرے) دردناک عذاب بھی۔

۵۔ عقیدۂ آخرت ایک اخلاقی و سماجی ضرورت

عقیدۂ آخرت صرف ایک عقیدہ ہی نہیں ہے، یہ ہماری ایک ناگزیر اخلاقی اور سماجی ضرورت بھی ہے۔ ایک ایسی سماجی ضرورت کہ اس کے بغیر نہ تو انسانی سماج کو پائدار اور مستحکم بنیادیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی سماجی نظام بہت دنوں تک انتشار سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسان مختلف النوع داعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض داعیات منفی اور بعض مثبت نوعیت کے ہیں۔ منفی داعیات کو کنٹرول کرنے کے لیے عقیدۂ آخرت سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ آج عقیدۂ آخرت کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ انسان کے منفی داعیات کو کھلی چھٹی مل گئی ہے۔ چوری، رہزنی، عصمت دری، شراب نوشی، کذب و افترا، مکر و فریب اور سماج کے کمزور طبقات پر ظلم و ستم آئے دن کا معمول بن گیا ہے۔ ان جرائم کی رفتار جس تیزی

Marfat.com

کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین اس کے منفی داعیات کو کنٹرول کرنے میں بالکل ناکام ہو چکے ہیں۔ لاکمیشن کے چیرمین ایچ، آر، کھنا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم نے قانون کی حکم رانی کی جگہ آدمیوں کی حکم رانی قبول کر لی ہے۔ لیکن جونہی انسانی فطرت کے سنگین حقائق نے آدمی کی خود غرضی، انانیت اور اس مقولے کی صداقت کو طشت ازبام کر دیا کہ اقتدار اور بالخصوص اقتدار مطلق انسان کو بدعنوان بنا دیتا ہے، ہم اسی وقت پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوشیار اور باخبر ہو کر قانون کی حکم رانی کی طرف دوبارہ پلٹ آئے ہیں[1]"

قانون کی حکم رانی ہو یا آدمیوں کی حکم رانی۔ اب تک کا تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ دونوں ہی انسان کے منفی داعیات (Negative Instincts) کو کنٹرول کرنے میں غیر موثر ثابت ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانین خواہ کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں لیکن یہ اسی وقت موثر ہو سکتے ہیں جب ان کی تنفیذ کرنے والے افراد خود اپنے منفی داعیات پر قابو یافتہ ہوں اور انسان کے منفی داعیات کو جو چیز قابو میں رکھ سکتی ہے وہ صرف روز آخرت محاسبۂ اعمال اور اس کی جزا و سزا کا یقین ہے۔

یہ صورتِ حال اس بات کی دلیل ہے کہ عقیدۂ آخرت انسان کی ایک ناگزیر اخلاقی اور سماجی ضرورت ہے، اور اس سے صرف نظر کر کے اس دنیا میں ایک صالح معاشرہ اور عادلانہ نظام حیات کا قیام ناممکن ہے۔

۶۔ ضمیر کا وجود

انسان کو برائیوں سے روکنے میں ضمیر انسانی کی بے غرضانہ خدمات سے کون انکار

---

[1] اسٹیٹس مین ۲۹ جنوری ۷۹ء۔

کرسکتا ہے۔ضمیر کا وجود بذات خود حیات بعد موت کا ایک اہم ثبوت ہے۔ اگر اس دنیا کے بعد کوئی دوسری دنیا نہیں ہے تو پھر ضمیر انسانی کا امر و نہی کیا معنی رکھتا ہے، اور کیوں یہ انسانی زندگی کا ایک جز و لازم بن کر رہ گیا ہے کہ کسی حالت میں بھی انسان اس سے گلو خلاصی حاصل نہیں کرسکتا۔ آدمی جلوت میں ہو یا خلوت میں، شب کے اندھیرے میں ہو یا دن کے اجالے میں، ویران چٹیل میدان میں ہو یا کسی آباد بستی میں، خشکی پر ہو یا سمندر کی پشت پر، ہر حال میں وہ اس کو برائی سے روکتا اور اچھائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس ناصح مشفق کا وجود بتاتا ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کا وجود بھی ضرور ہے جہاں انسان اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا پائے گا۔ اگر کسی فعل کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو پھر خیر و شر کی فعلی تقسیم اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتی، اور پھر انسان کے اندر نفس لوّامہ کا وجود بے مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت میں نفس لوامہ کا وجود حیات بعد موت کی ایک مضبوط دلیل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝

(قیامہ: ۴)

نہیں، میں روز قیامت اور نفس لوامہ کی قسم کھاتا ہوں (کہ منکرین آخرت اپنے دعویٰ میں سچے نہیں ہیں) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ یقیناً ہم ایسا کرسکتے ہیں ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کا پور پور بالکل درست حالت میں کر دیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ضمیر انسانی کوئی مستقل اور دائم بالذات چیز نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور ملکوں میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک ہی فعل کو ایک ملک کا آدمی برا سمجھتا ہے اور دوسرے ملک کا آدمی اسے اچھا سمجھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ضمیر کا وجود سماجی حالات کی پیداوار ہے۔ ہر سماج خود اپنا ایک معیار خیر و شر بنا لیتا ہے اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ انسانی فطرت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ انسانی ضمیر بعض حالات میں خارجی دباؤ کے تحت

Marfat.com

دب جاتا ہے اور اپنے فرضِ منصبی سے عارضی طور پر سبکدوش ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نفسِ لوّامہ سکوت اختیار کر لیتا ہے اور نفسِ امّارہ کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور ہم نفسِ امّارہ کے اسی غلبہ کو غلطی سے تائیدِ ضمیر کا نام دے لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے یا وہ نفسِ امّارہ کا قالب اختیار کر لیتا ہے، وہ ہر حالت میں زندہ رہتا ہے خواہ اس کی یہ زندگی عارضی طور پر محسوس نہ ہو۔ لیکن ہر قوم پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کا ضمیر جاگ اُٹھتا ہے اور معیارِ خیر و شر پھر وہی قائم ہو جاتا ہے جو ازل سے انسانی فطرت کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔

آج سے دو ہزار سال پہلے یعنی سقراط کے زمانہ میں بھی لوگ علانیہ کہنے لگے تھے کہ نیکی اور بدی اضافی چیزیں ہیں اور کسی فعل کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ ضمیر کے تغیّر پذیر قانون سے نہیں ہوتا بلکہ اس فعل کی کامیابی سے ہوتا ہے۔ سقراط نے کمال جرأت کے ساتھ اعلان کیا کہ نیکی و بدی کا یہ تصور سراسر غلط ہے اس نے کہا:

"نیکی و بدی کا معیار انسانی ضمیر ہے۔ یہ ضمیر بعض حالات میں جو بدل جاتا ہے تو اس کا یہ بدلنا بالکل ظاہری ہے، اور کسی دباؤ یا جبر کا نتیجہ ہوتا ہے"۔[1]

۷۔ دائمی مسرت کی فطری طلب

دنیا کا کون انسان ایسا ہے جو سکون و اطمینان کا طالب اور رنج و غم سے نجات کا خواہاں نہ ہو، لیکن آج کا انسان اپنی ہر ممکن سعی و جاں فشانی کے باوجود دائمی سکون و اطمینان سے محروم ہے، اور رنج و آلام کل کی طرح آج بھی اس کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی اکثریت سکون کی دولت سے تہی دامن ہے، اور جن کو قدرے سکون و اطمینان حاصل بھی ہے وہ بالکل عارضی ہے۔ ایک شخص سخت جد و جہد کے بعد جب ایک پر سکون زندگی کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اس کی آسائشوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو کبھی اچانک موت

---

[1] تاریخِ فلسفہ، الفرڈ ویبر، مترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ص ۵۷

Marfat.com

ن اس کی مسرتوں کی بساط الٹ دیتی ہے اور کبھی بیماری اور عالم پیری جو خود ایک عذاب ہے، اس کی زندگی کو دردناک بنا دیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس دنیا میں راحت وسکون کے لمحات بہت مختصر اور حزن وملال کا دور نہایت طویل ہوتا ہے۔

اس غم کا صرف ایک ہی مداوا ہے کہ ہم اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم کریں جہاں حزن وخوف اور رنج والم کا کوئی نام ونشان بھی نہ ہوگا اور انسان کو مسرتِ ابدی اور حیاتِ جاوداں حاصل ہوگی جیسا کہ اس کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝ (فاطر: ۳۴، ۳۵)

اور وہ کہیں گے: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے رنج وغم دور کیا۔ بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا اور بڑا قدرداں ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے دارِ ابدی میں لا اتارا جہاں نہ تو ہم کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی (کسی کام کی وجہ سے) کوئی سستی وخستگی لاحق ہوگی۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(زخرف: ۷۱)

اور وہاں ہر وہ چیز ملے گی جس کو جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی اور تم اس میں (جنت) ہمیشہ رہو گے۔

عقیدۂ آخرت سے متعلق ہم نے سطور بالا میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ عقیدۂ آخرت زندگی کا ایک رجائی تصور دیتا ہے یعنی اس تصور کے مطابق موت کے عمل سے انسانی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک دوسری شکل میں اس کا سفرِ ارتقار جاری رہتا ہے فی الواقع موت، مادی اور روحانی زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے، ادھر آدمی نے آنکھیں بند کیں اور اُدھر وہ مادی زندگی کی سرحد سے نکل کر روحانی زندگی کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس انتقالِ مکانی میں صرف ظاہری ہیئت میں تبدیلی

ہوتی ہے، اصل حقیقت یعنی روح میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

یہ تصورِ زندگی لازماً اس خوف اور یاس و افسردگی کو ختم کرتا ہے جو موت کے تصور سے ایک انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ تصورِ زندگی کہ اس مادی زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے آدمی کو ہمہ آن خوف اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حیات بعد موت کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے لیے حیات دنیوی کے خاتمہ کا تصور سوہانِ روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جو لوگ حیات اُخروی پر یقین رکھتے ہیں وہ شمع زندگی کے گل ہو جانے سے کبھی ہراساں نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی کا اختتام نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہے۔ ان کے نزدیک موت ایک درماندہ راہ روکی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا ہے اور پھر بیدار ہو کر سرگرم سفر ہو جاتا ہے، میرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؏

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

آپ زندگی کے متعلق ان دونوں تصورات پر غور کیجئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کون سا تصور زندگی صحیح ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت انسان کو یاس و قنوطیت اور حزن و خوف کے اندھیروں سے نکال کر اطمینان و سکون کی روشنی عطا کرتا ہے، حیات دنیوی کو بامعنی و بامقصد بناتا ہے، اور اس کے نقص و ناتمامی کی تلافی کرتا ہے۔

عقیدۂ آخرت کے متعلق بعض غلط فہمیاں اور اُن کا ازالہ

آج مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو عقیدۂ آخرت پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا کر دیے گئے ہیں کہ نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور بزرگانِ دین کے صدقے میں وہ جنت میں ضرور جائیں گے خواہ ان کے اعمال اچھے ہوں یا برے گویا روزِ آخرت جزا و سزا کا فیصلہ اعمال کی اچھائی اور خرابی کے بجائے تعلق اور سفارش پر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور سرے سے عقیدۂ آخرت کی ضرورت ہی کو باطل کر دیتا ہے۔ آخرت پر ایمان رکھنے کا

Marfat.com

مقصد تو یہ ہے کہ ایمان رکھنے والا ہر عمل سے پہلے سوچ لے کہ اسے ایک دن اپنے مالک وآقا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اگر اچھا عمل کرے گا تو مالک خوش ہو کر انعام سے سرفراز کرے گا، اور اگر غلط کام کرے گا تو مالک ناراض ہو کر پاداشِ عمل میں سزا دے گا۔ اب اگر کسی کی سعی و سفارش سے غلط صحیح بن جائے اور عمل کرنے والا اپنے عمل کے اثرات و نتائج سے بچ جائے تو پھر ایک دوسری زندگی کا تصور بالکل مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ بھلا ایسی حیات میں کیا معقولیت ہو سکتی ہے جس میں نیکی اور بدی دونوں ہم پلہ ہوں، اور جہاں معاملات کے فیصلے عدل و انصاف کے بجائے سعی و سفارش کی بنیاد پر کیے جاتے ہوں۔

کیا ہم نے خدا کی عدالت کو انسانی عدالت سے بھی کم تر درجہ کی چیز سمجھ لیا ہے؟ ہم اس دنیا میں اسی حاکم اور عدالت کو پسندیدہ اور معیاری عدالت سمجھتے ہیں جہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو، اور اس حاکم و عدالت کو ناپسندیدہ اور ناقص سمجھتے ہیں جہاں عدل و قسط کو بالائے طاق رکھ کر صرف رشوت اور سفارش کی بنیاد پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس دنیا کے منصف اور اس کی عدالتوں کے بارے میں ہمارا یہی تصور اخروی عدالت اور اس کے منصف کے متعلق یکسر تبدیل کیوں ہو جاتا ہے؟ ایک ایسی عدالت جس سے زیادہ عظیم عدالت اور ایک ایسا منصف جس سے زیادہ عادل و منصف کا ہم تصور نہیں کر سکتے کیا اس عادل و منصف کی عدالت میں کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ کسی کی سفارش سے برے افعال کی سزا سے بچ سکتا ہے؟

قرآن مجید نے اس سلسلے میں کسی ادنیٰ اشتباہ کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں خبردار کر دیا ہے کہ روز آخرت ہر شخص اپنے نتائجِ اعمال سے لازماً دوچار ہو گا۔ خدا جس ہستی کا نام ہے وہ سراپا عدل ہے۔ اس کے یہاں نیکی بہر حال نیکی ہے اور بدی بہر صورت بدی ہے۔ جو یہاں نیک ہو گا وہ وہاں بھی نیک سمجھا جائے گا اور اپنی نیکی کی جزا ضرور پائے گا اور جو یہاں بد ہو گا وہ وہاں بھی بد ہی سمجھا جائے گا اور اپنی بداعمالیوں کی سزا پا کر رہے گا جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ (الانفطار: ۱۳-۱۶)

بے شک نیکوکار لوگ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے اور بدکار لوگ شعلہ زن جہنم میں، جہاں

وہ جزا کے دن داخل ہوں گے، اور وہاں سے کسی طرح فرار حاصل نہ کر سکیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَاَمَّا مَنْ طَغٰیۙ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَاۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰیؕ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰیۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰیؕ (النزعات)

پس جس نے سرکشی کی اور (آخرت پر) حیات دنیوی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور جو شخص اپنے رب کے حضور جواب دہی سے ڈرا اور نفس کو ہوائے نفسانی سے بچائے رکھا۔ اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ روز آخرت خدا ترس اور غیر خدا ترس انسانوں کے نتائج اعمال یکساں نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ عدل و انصاف کے منافی ہے۔ عقل انسانی ایک ثانیہ کے لیے بھی یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اچھے اور برے اعمال کے نتائج یکساں ہو سکتے ہیں، نور و ظلمت اور حرارت و برودت کو یکساں کون کہہ سکتا ہے؟ قرآن پاک کی یہ آیت اسی حقیقت کی ترجمان ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَؕ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ (قلم: ۳۵-۳۶)

کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کے مساوی کر دیں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

جو شخص عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ یہ بھی تسلیم کرے کہ:

۱۔ روز قیامت، عادل مطلق یعنی خدائے علیم و خبیر کی عدالت میں کسی استثناء کے بغیر ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ ہوگا۔ کوئی شخص خواہ وہ دنیا میں کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ رہا ہو، اعمال کی باز پرس سے بچ نہیں سکے گا۔

۲۔ ہر شخص اپنے نتائج اعمال کا لازماً ذمہ دار ہوگا یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ اس دنیا میں عمل تو برا کرے لیکن روز قیامت اس کا نتیجہ اچھا نکل آئے۔ جو بو کر جو ہی کاٹے گا، گیہوں نہیں کاٹے گا۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے اعمال کے نتائج سے فرار حاصل کر سکتا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ قرآن کا واضح اعلان ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌۙ (مدثر: ۳۸)

ہر متنفس اپنے اعمال کے نتائج میں محبوس ہوگا۔

Marfat.com

۳۔ روزِ آخرت کامیابی اور ناکامی کا تمام تر مدار ایمان اور حسن عمل پر ہوگا۔ اس دن کسی کی دوستی اور قرابت داری کسی کے کام نہ آئے گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا رہنما، مذہبی پیشوا اور پیغمبر کیوں نہ ہو۔ اس دن فیصلے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں کوئی شخص ادنیٰ مداخلت کا بھی مجاز نہ ہوگا۔ روزِ جزا کی اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، اور یہ آیت روزِ جزا کے متعلق تمام غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیتی ہے:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ (انفطار: ۱۷-۱۹)

تمہیں کیا معلوم کہ روزِ جزا کیا ہے؟ ہاں تمہیں کیا معلوم کہ روزِ جزا کیا ہے؟ روزِ جزا وہ ہے کہ جس دن کوئی آدمی کسی آدمی کے کچھ کام نہ آسکے گا، اور جس دن فیصلہ کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔

۴۔ اس دن اللہ کے سوا اصلاً نہ کوئی کسی کا شفیع ہوگا اور نہ حامی و مددگار۔ بخشش و عذاب کے سارے اختیارات صرف خدا کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اس لیے بخشش و مغفرت کی امید صرف اسی کی ذات سے رکھنی چاہئے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کو شفیع و پشتیبان سمجھنا عقیدۂ آخرت اور آیاتِ قرآنی دونوں سے انحراف کرنا ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں شفاعت بے قید کی نفی کی گئی ہے اور صرف خدا ہی کو شفیع قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ آیا ہے:۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

(سجدہ: ۴)

اس کے سوا نہ کوئی تمہارا کارساز ہے اور نہ شفیع پھر کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

دوسری جگہ آیا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاۗءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (زمر: ۴۳، ۴۴)

Marfat.com

کیا انھوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو شفیع قرار دے رکھا ہے؟ خواہ وہ کوئی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی علم و عقل سے بہرہ ور ہوں۔ کہہ دو کہ شفاعت کا سر رشتہ تو محض اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اسی کی ہے۔ تم (ایک دن) اسی کے پاس پلٹ کر جاؤ گے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ (انعام: ۵۱)

اور اس سے ان لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات کا خوف رکھتے ہوں کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کے حضور حاضر کیے جائیں گے جہاں اس کے سوا ان کا کوئی حامی اور شفیع نہ ہوگا، شاید وہ (اپنی موجودہ روش سے) باز آجائیں۔

۵۔ روز آخرت کسی قسم کا کوئی فدیہ بھی قبول نہ کیا جائے گا یعنی وہاں دنیاوی عدالتوں کی طرح رشوت نہیں چلے گی کہ کچھ دے دلا کر سزا سے چھٹکارا مل جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (بقرہ: ۴۸)

ڈرو اس دن سے کہ جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آسکے گا، نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ (رہائی کے لیے) کوئی فدیہ ہی قبول کیا جائے گا اور نہ ان کو کہیں سے کوئی مدد ہی مل سکے گی۔

۶۔ اس دن خدا کی عدالت میں خدا کے اذن کے بغیر کسی کو لب کشائی کی اجازت نہ ہوگی اور جس کو بولنے کی اجازت ملے گی وہ صرف اسی شخص کے متعلق کچھ کہہ سکے گا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کچھ سننا پسند فرمائے گا۔ اس کے علاوہ جو بات حق ہوگی اور جس کے متعلق اس کو واضح علم ہوگا، وہی بات کہے گا، بے جا سفارش اور خلاف حق وکالت اور اٹکل سے کچھ کہنے کی وہاں قطعاً گنجائش نہ ہوگی۔ اس لیے کہ وہ عدالت اس علیم و خبیر ہستی کی عدالت ہوگی جس کی نگاہ سے ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی بھی واقعہ پوشیدہ نہ ہوگا، اور ہر آدمی کی اگلی اور پچھلی زندگی کے ایک ایک فعل کا مکمل ریکارڈ تمام ضروری شہادتوں کے ساتھ

Marfat.com

وہاں موجود ہوگا۔ شفاعت کی اس حقیقت کو قرآن پاک نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۱۱۰)

اس دن (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی بجز اس شخص کے جس کے واسطے اللہ نے اجازت دے دی ہو، اور جس کی بات سننے پر وہ راضی ہو گیا ہو۔ وہ ان کے اگلے اور پچھلے سب احوال کو جانتا ہے جب کہ دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (زخرف: ۸۶)

اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے، الا یہ کہ کوئی شخص علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ۖ قَالُوا الْحَقَّ ۖ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝ (سبا: ۲۳)

اور (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی، بجز اس شخص کے جس کے بارے میں وہ (خدا) اجازت دے دے یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ باہم پوچھیں گے "تمہارے رب نے کیا فیصلہ صادر فرمایا"، وہ کہیں گے کہ وہی جو حق بات ہے، وہ بلند و بالا ذات ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ روز قیامت کسی کی سفارش ناحق کو حق اور حق کو ناحق نہیں بنا دے گی بلکہ شفاعت کے جواب میں اللہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی کہ اس کی بزرگی اور کبریائی اور عدل و قسط کا یہی تقاضا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفاعت کے جواب میں فرمائی ہے۔ روز قیامت حضرت

Marfat.com

عیسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت کے بارے میں فرمائیں گے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (مائدہ: ۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر انھیں معاف کر دے تو تو طاقت و قدرت اور حکمت والا ہے۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞ (مائدہ: ۱۱۹)

آج کے دن تو راست بازوں کو صرف ان کی راست بازی ہی نفع دے گی۔ ان کے لیے باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ عظیم کامیابی ہوگی۔

شفاعت انبیاء کی بس یہی حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ سمجھنا قرآنی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ جو لوگ شفاعت انبیاء کے نام پر خوش گمانی میں، اور نتیجے کے طور پر بداعمالیوں میں مبتلا ہیں، وہ دراصل فریب نفس کا شکار ہیں کسی ولی اور بزرگ کو چھوڑیئے خود آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی ذات گرامی سے مسلمان بے قید اور عام شفاعت کی امید لگائے بیٹھا ہے، قریش اور اپنے اہل خاندان سے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آیت انذر عشیرتك الاقربين نازل ہوئی تو آپ نے قریش کے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا:۔

"اے گروہ قریش، تم اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیوں کہ میں تم لوگوں کے لیے اللہ کی طرف سے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اے بنی قصی کے گروہ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیوں کہ میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اے بنی عبد مناف کے گروہ! تم اپنے آپ کو دوزخ سے

بچاؤ کیوں کہ میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، اے بنی عبدالمطلب
کے گروہ! تم بھی اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ کیونکہ میں تمہارے نفع
اور نقصان کا مالک نہیں، اے محمد کی بیٹی فاطمہ! تم اپنے آپ کو دوزخ سے
بچاؤ کیوں کہ میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں، بے شک مجھ سے
تمہاری قرابت ہے اور میں عنقریب اس کا حق ادا کردوں گا۔"[1]

روز آخرت اللہ کی عدالت میں انبیاء و رسل کو شفاعت کا موقع صرف اس لیے ملے گا کہ وہ اپنی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ وکیل ہیں۔ اس لیے بندوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو بحیثیت وکیل کے کچھ کہنے کا موقع دیا جائے گا لیکن وہ اس منصف حقیقی کی عدالت میں جو ہر صحیح اور غلط امر سے بذات خود واقف ہوگا، اس کے سوا اور کیا کہیں گے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (مائدہ : ۱۱۸)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کردے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ وہی بات ارشاد فرمائے گا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی هٰذا الیوم ینفع الصادقین صدقهم (آج کے دن تو راست بازوں کو صرف ان کی راست بازی نفع دے گی)

قرآن میں بعض مقامات پر جس خصوصی شفاعت کا ذکر ملتا ہے اس کے مستحق صرف وہ بندے ہوں گے جو دنیا میں ظلم و سرکشی کے بجائے حتی الوسع اطاعت کی راہ میں گام زن رہے ہوں گے، لیکن بتقاضائے بشریت ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہو گئے ہوں گے، اور دنیا میں وہ ان گناہوں پر توبہ و استغفار اور اصلاح حال کی سعی بھی کرتے رہے ہوں گے۔ ایسے بندوں پر خدا یقیناً مہربان ہوگا، اور انبیاء و رسل کو بھی ان کے متعلق کچھ کہنے کی اجازت مرحمت فرمائے گا۔ قرآن پاک میں ایک جگہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] ترمذی، ابواب تفسیر القرآن جلد دوم۔ رواہ عن ابی ہریرۃؓ۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ (نسا: ۶۴)

اور اگر جس وقت وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے اس وقت وہ تمہارے پاس آجاتے، پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو ضرور وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ○ (طٰہٰ: ۸۲)

میں ہر اس شخص کے لیے غفار ہوں جس نے (گزشتہ افعال سے) توبہ کی اور جو ایمان لایا اور جس نے اچھے کام کیے پھر وہ راہ ہدایت پر چلتا رہا۔

قرآن مجید نے یہ بات نہایت واضح لفظوں میں بیان کردی ہے کہ روز آخرت نہ تو فاسقوں (نافرمانوں) مجرموں، مشرکوں اور کافروں کی کوئی شخص شفاعت کرے گا، اور نہ اللہ کی رحمت و مغفرت ہی ان کے حصہ میں آئے گی جیسا کہ ایک جگہ آیا ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ○ (مومن: ۱۸)

ظالموں کے لیے نہ کوئی حامی و مددگار ہوگا، اور نہ کوئی ایسا سفارش کرنے والا کہ اس کی بات ان ہی لی جائے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ○ (روم: ۱۳)

اور جس دن وہ گھڑی آئے گی، مجرمین متحیر، غمگین اور مایوسی کا شکار ہوں گے، اور وہ جن جن لوگوں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ ان میں سے کوئی ان کی سفارش کے لیے آگے نہ بڑھے گا اور وہ (بھی) اپنے شریکوں کا انکار کردیں گے۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ

مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۧ (توبہ: ۸۰)

تم ان کے لیے خواہ معافی چاہو اور خواہ نہ چاہو تم اگر ان کے لیے ستر بار بھی معافی چاہو گے تو بھی اللہ انھیں معاف نہ کرے گا۔ اور یہ اس بنا پر کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ نافرمان قوم کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا
اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ (توبہ: ۱۱۳)

نبی اور اہلِ ایمان کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے معافی کے خواستگار ہوں خواہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں بالخصوص اس وقت جب کہ انھیں واضح طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دوزخی ہیں۔

آخری دو آیتوں میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ آپ سے صاف صاف اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ اس کے یہاں کسی کافر و مشرک اور ظالم و سرکش کی شفاعت کی گنجائش نہیں ہے اور ایک نبی کے مقام و منصب سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی شفاعت کا خیال بھی اپنے دل میں لائے۔

جو شخص بھی عقیدۂ آخرت کو مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ مذکورہ چھ باتوں کو بھی دل سے تسلیم کرے کہ عقیدۂ آخرت کا صحیح طور سے ماننا انہی چھ باتوں کے ماننے پر منحصر ہے۔ جو ان کو تسلیم نہیں کرتا وہ فی الواقع روزِ آخرت کے قرآنی تصور پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ آج ہمارے اعمال کی خرابیوں کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے عقیدۂ آخرت کے ایک ایسے تصور کو قبول کر لیا ہے جو سراسر غیر قرآنی ہے، اور اس سلسلے میں اسی کج فہمی، خوش اندیشی اور فریبِ نفس میں مبتلا ہیں جس میں ایک مدت دراز سے یہود و نصاریٰ مبتلا چلے آرہے ہیں۔ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا موجودہ طرزِ فکر و عمل بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بعض جسمانی امراض کی طرح روحانی امراض بھی موارثت ہوتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے تمام روحانی امراض اسی توارث کی نشاندہی

کرتے ہیں۔

حقیقتِ اسلام

ایمان کے لغوی، قرآنی اور شرعی مفہوم سے واقفیت کے بعد ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے معنی ومفہوم سے بھی واقف ہو جائیں تاکہ فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ رہے، اور اسلامی نظام فکر کے ساتھ اس کے نظام عمل سے بھی بخوبی آگاہ ہو جائیں، نیز یہ بھی جان لیں کہ ان دونوں نظاموں یعنی ایمان و اسلام میں ربط کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ دونوں دو جدا چیزیں ہیں یا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو (Aspects) ہیں۔

اسلام کا لغوی مفہوم

اسلام کے لغوی معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے تقریباً ہر جگہ اس کے معنی اطاعت و انقیاد ہی کے ہیں مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ (البقرہ : ۱۲۸)

اے پروردگار آپ ہمیں اپنا مطیع بنا لیجئے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (البقرہ : ۱۳۱)

جب اس کے رب نے کہا کہ مطیع ہو جاؤ تو اس نے کہا "میں دونوں جہاں کے پروردگار کا مطیع و فرماں بردار ہو گیا۔"

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران : ۸۳)

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ سب خوشی یا ناخوشی سے اس کی فرماں برداری کر رہا ہے اور سب کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

Marfat.com

سورہ نمل میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے اور ہر جگہ اس کا مفہوم اطاعت ہے مثلاً:

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ (نمل: ۳۱)

میرے مقابلہ میں بڑائی نہ جتاؤ اور سیدھے طور پر میرے پاس مطیع و منقاد بن کر حاضر ہو جاؤ۔

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ (نمل: ۳۸)

اس نے کہا "اے سردارو! قبل اس کے کہ وہ میرے حضور مطیع ہو کر آئے، تم میں کون ایسا ہے جو اس کے تخت کو میرے پاس اٹھا لائے۔

وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝ (نمل: ۴۲)

ہم اس سے پہلے ہی حقیقت حال سے باخبر اور مطیع ہو چکے تھے۔

قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (نمل: ۴۴)

اس نے کہا: اے میرے رب میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے اور (اب) سلیمان کے ساتھ اللہ دونوں جہان کے پروردگار کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے

غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ساری کائنات ایک محکم نظام کے اندر جکڑی ہوئی ہے ہر شے ایک متعین قانون اور ضابطہ کی پابند ہے اور ذرہ برابر اس سے انحراف نہیں کر رہی ہے۔ قدرت نے ہر چیز کی تخلیق، نشوونما اور بقائے حیات کا جو ضابطہ مقرر کر دیا ہے وہ اسی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ آسمان کو دیکھیے، ان گنت عظیم الجثہ سیارے فضائے نیلگوں میں گردش کر رہے ہیں، مگر کمال نظم دیکھیے کہ کوئی سیارہ کسی دوسرے سیارے کی گردش میں خلل انداز نہیں ہوتا بلکہ جس سیارہ کے لیے جو گردشی راستہ متعین ہے وہ اسی راستے پر ایک فرماں بردار غلام کی طرح چلا جا رہا ہے، نہ تو ان کی رفتار میں کہیں سے کوئی فرق واقع ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے دائرہ حرکت میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے۔ ان کے خالق نے ان کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اور جس کام کی انجام دہی

Marfat.com

پر ان کو مامور کر دیا ہے وہ بے چون وچرا اس کو انجام دے رہے ہیں۔ سورج اپنے مدار پر گردش کر رہا ہے اور اس کے طلوع و غروب کا جو ضابطہ خالق کائنات نے ازل سے مقرر کر دیا ہے وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ یہی حال چاند کا ہے، وہ بھی ایک فرض شناس خادم کی طرح زمین کے گرد اوقات کی پابندی کے ساتھ محو طواف ہے۔ زمین کو دیکھئے۔ اس پر سمندر، دریا، پہاڑ، بے شمار حیوانات اور نباتات کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ ان سب کے لیے فطرت نے جو ضابطۂ کار متعین کر دیا ہے وہ اس کی پابندی کر رہے ہیں۔ ایک بیج ایک متعین منصوبہ کے تحت ہی زمین سے اگتا ہے، اور نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا درخت بن جاتا ہے۔ آج تک کبھی اور کہیں یہ حادثہ رونما نہیں ہوا کہ کوئی بیج درست حالت میں اور موزوں زمین میں ڈالا گیا ہو اور زمین نے اسے اگانے سے انکار کر دیا ہو۔ سورج کی حرارت سے روزانہ کروڑوں ٹن پانی بھاپ میں تبدیل ہو رہا ہے اور ایک متعین نظام اور ضابطے کے تحت زمین کے مختلف خطوں پر بارش ہوتی ہے۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سمندر نے اپنے پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے سے روک دیا ہو یا بادلوں نے برسنے سے انکار کر دیا ہو۔ یا ہواؤں نے بادلوں کو زمین کے مختلف مقامات تک لے جانے کا کام ترک کر دیا ہو۔ قدرت نے جس کے سپرد جو کام کر دیا ہے وہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے انجام دے رہا ہے۔

غرض یہ کہ آپ اس کائناتِ ارض و سما کی جس چیز کو دیکھئے گا وہ مطیع و فرماں بردار اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مصروف ملے گی۔ اس اعتبار سے کائنات کی ہر چیز مسلم ہے اور پوری کائنات جادۂ اسلام پر گامزن ہے۔ اسی کو قرآن پاک میں زمین اور آسمانوں کی سجدہ گزاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ (حج: ۱۸)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے خدا کے آگے سجدہ ریز ہے، اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، حیوانات اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد بھی (سر اطاعت جھکائے ہوئے ہے)

Marfat.com

جب ساری کائنات مُسلم ہے اور اس کا دین ، اسلام یعنی اطاعت ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ انسان جو اسی کائنات کا ایک جزو ہے ، اس کا دین کیا ہونا چاہیے؟ عقل تو یہی کہتی ہے کہ اس کا دین بھی اسلام (اطاعت) ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿ (آل عمران : ۸۳)

کیا وہ خدا کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے طلبگار ہیں حالانکہ زمین اور آسمانوں میں جو چیز بھی ہے طوعًا و کرہًا اسی کی مطیع ہے ۔ اور سب کو خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو دین (قانون عمل) ساری کائنات کا ہے وہی دین انسانوں کا بھی ہے ۔ اور یہ معلوم ہو چکا کہ کائنات کا دین (قانون عمل) اسلام یعنی اطاعت و بندگی ہے، اس لیے انسان کا دین بھی اسلام ہوا ۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے تو اس سے یہی مراد ہے کہ اس کائنات میں جو اٹل قانون جاری و ساری ہے وہ اطاعت و انقیاد کا قانون ہے ، اور اسی قانون اطاعت کا نام اسلام ہے ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۗ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿ (آل عمران : ۱۹، ۲۰)

بے شک دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے ۔ اہل کتاب نے اس سلسلہ میں جو اختلاف پیدا کیا ہے تو وہ لاعلمی کی بنا پر نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ صرف ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب ایسا کیا ہے ۔ اور جو شخص اللہ کی آیات سے انکار کرے گا تو اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے پس اگر وہ تم سے بحث و مجادلہ کریں تو ان سے صاف کہہ دو کہ میں اور میرے پیرو تو اللہ

ہی کے مطیع ہو چکے، اور اہل کتاب اور عرب کے اُمّیوں سے کہو: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ اسلام لائیں تو بیشک انھوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو تمہارا کام صرف پیغام رسانی ہے، اور اللہ بندوں پر نگراں ہے۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ لفظ اسلام کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس نے دین کے لیے الاسلام کا لفظ اسی لیے اختیار کیا کہ اسلام کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانون سعادت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے یہ کچھ انسانوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقا و قیام کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں تو کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے۔"[1]

مسلم کے حقیقی معنی

کائنات ہستی کی ہر چیز کی طرح انسان کا جسم بھی ایک محکم نظام کے اندر جکڑا ہوا ہے۔ اس کی تخلیق، نشوونما اور عمل کا جو قانون اس کے خالق نے بنا دیا ہے وہ اس کا مکمل طور پر پابند ہے۔ اس اعتبار سے انسان کے سارے اعضا، تکوینی طور پر مُسلم ہیں، کیونکہ وہ خدا کے بنائے ہوئے قانون عمل کا اتباع کر رہے ہیں۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک چیز 'ارادہ و اختیار' سے بھی نوازا ہے جس سے ساری کائنات محروم ہے۔ اس ارادہ و اختیار کا تعلق انسان کے افعال کی نوعیت سے ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو آنکھ عطا کی تاکہ وہ اس سے دیکھے۔ جہاں تک آنکھ کے فعل بصارت کا تعلق ہے وہ تو قدرت کے بنائے ہوئے ضابطے

---

[1] ترجمان القرآن سورہ فاتحہ ص۲۲۶

Marfat.com

کے مطابق انجام پاتا ہے، لیکن انسان آنکھ سے کیا چیز دیکھے اور کیا نہ دیکھے یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی اختیار کو جب وہ اپنی مرضی سے خدا کی مرضی کا پابند بنا دیتا ہے تو وہ فی الواقع مکمل طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نگاہیں نیچی رکھو اور غیر محرم عورتوں کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھو، تو اگرچہ وہ ان کی طرف دیکھنے پر قادر ہے لیکن اس قدرت کے باوجود ایک مومن صرف اس لیے ان کی طرف نظر بد نہیں اٹھاتا کہ یہ اس کے خالق و مالک کی مرضی کے خلاف ہے۔

گویا مسلم ہونے کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اپنی خواہشات اور پسند و ناپسند سے دست بردار ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا و عدم رضا اور پسند و ناپسند کے آگے کامل طور پر جھک جائیں۔ جب ہم ایسا کرلیں گے تو ہم بھی کائنات کی ہر شے کی طرح مسلم کہلائیں گے، لیکن ہمارا مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک ساری کائنات سے بلند تر ہوگا، کیونکہ اس کا اسلام اختیاری نہیں بلکہ جبری (فطری) ہے اور ہمارا اختیاری ہے۔ ہم نے اپنی مرضی اور خوشی سے اس کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔ جو شخص بھی قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کرے گا وہ اسلام اور مسلم کی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اسے ایک غیر مسلم کی زبان سے بھی سنیئے۔ ڈاکٹر بھگوان داس جی فرماتے ہیں:

"لفظ اسلام نہایت بلند اور عمیق مفہوم کا حامل ہے اور جو بلاشبہ مذہب کی اصلی روح اور ماہیت ہے۔ یہ لفظ سلم سے نکلا ہے جس کے معنی امن اور شانتی کے ہیں، اور اس کا مطلب خدا کو پورے اطمینان قلب کے ساتھ تسلیم کرنا ہے (Peaceful Acceptance of God) یعنی پرسکون دست برداری، کامل تسلیم و رضا، خود سپردگی اور اطاعت و مغلوبیت یا دوسرے لفظوں میں حقیر ذات کا عظیم ذات کے سامنے سرافگندہ ہوجانا، اور خود بینی اور انانیت کو ترک کر کے خود کو آفاقیت میں گم کر دینا ہے' یا "اے خدا[1] تیری مرضی پوری ہو میری نہیں"[2]

---

[1] یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے۔ دیکھئے لوقا باب ۲۲: ۴۲۔

[2] Should Religion be Abolished. Vol I. P. 375, Baba Khaleel Das.

پس حقیقی معنوں میں وہی شخص مسلم ہے جو خود کو خدا کی مرضی کے سپرد کردے، انانیت تکبر اور خود پرستی کو چھوڑ کر عجز و انکسار، فروتنی و خاکساری اور خدا پرستی کی روش اختیار کرے خواہشات جذبات اور اغراض کو فراموش کر کے اپنی ذات (Ego) کو خدا کی مرضی میں فنا کر دے۔

یہ خود سپردگی اور فنائیت محض کوئی نظریہ نہیں بلکہ یہ ایک عمل کا نام ہے اور اس کا اظہار ایک مومن و مسلم کی زندگی کے تمام افعال سے ہونا چاہیئے صرف زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ اسی طرح خود سپردگی اور فنائیت کا مفہوم صرف ذہنی اور روحانی استغراق نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح تر مفہوم جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ بندہ خدا کی مرضی کا پابند ہو جائے، زندگی کے ہر معاملے میں وہ صرف یہ دیکھے کہ اس کے خالق و مالک کی مرضی کیا ہے؟ مرضیِ مولا معلوم ہو جانے کے بعد کسی ادنیٰ پس و پیش کے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ یہی ایک سچے مومن و مسلم کا طغرائے امتیاز ہے۔ اور اسی شانِ بندگی پر حقیقی ایمان و اسلام کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسلام کا شرعی مفہوم

شرعی اعتبار سے جب اسلام کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کا اطلاق پانچ اُمور پر ہوتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"اسلام پانچ چیزوں پر مبنی ہے (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں (۲) نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا"[۱]

صحیح مسلم ابواب الایمان میں جو حدیث حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے اور جسے ہم ایمان کی بحث میں نقل کر چکے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہی اُمور خمسہ کا نام شرع میں اسلام ہے، اور جو شخص ان پر عمل کرتا ہے وہ از روئے شریعت مسلم ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام انہی پانچ اُمور تک محدود ہے اور باقی دیگر امور

---

[۱] ترمذی ابواب الایمان

Marfat.com

اس سے خارج ہیں۔ شرعی اعتبار سے انہی پانچ اُمور کو اسلام اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ داخل پانچ بڑے اعمال اطاعت ہیں جو ایک مسلم کے دیگر تمام افعال کے محافظ و نگراں کی حیثیت رکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مسلم کے جذبۂ اطاعت کی مشہود شکلیں ہیں۔

درحقیقت یہ پانچ اُمور جنھیں ارکان اسلام کہا جاتا ہے، ایک مسلم کی زندگی کو جادۂ مستقیم پر قائم رکھتے ہیں۔ اور اسے تسلیم و رضا اور صبر و شکر کے پیکر میں ڈھالتے ہیں بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے اور ان اعمال کے ظاہری آداب و رسوم پر ہی قانع نہ رہا جائے بلکہ ان کے حقیقی مقصد و منشار کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے اعمال کا تزکیہ کیا جائے۔ آج مسلمانوں کے اعمال کی خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے ان اعمال (ارکان اسلام) کے ظاہری آداب و رسوم کی درستگی ہی کو اصل مقصود سمجھ لیا ہے حالانکہ اس سلسلے میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً جب قرآن نے یہ کہا کہ "نماز فحشاء اور منکرات روکتی ہے" تو اس سے اس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ نماز چند کلمات زبان اور حرکات جسم ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اعمال کی طہارت و پاکیزگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ اگر اعمال طہارت و پاکیزگی سے خالی ہیں تو پھر زبان سے چند مخصوص کلمات کی ادائیگی اور مخصوص حرکات بدنی کا صدور لاحاصل ہے۔ عبادت کی ظاہری شکلوں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ان سے مقصود روح کی پاکیزگی اور اعمال کی درستگی ہے۔ اسے نہیں بھولنا چاہیے۔

متعدد احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام صرف چند عبادات کی ادائیگی کا نام نہیں ہے، بلکہ حسن اعمال سے عبارت ہے جو عبادات کا اصل مقصود و مطلوب ہے۔ کوئی انسانی عمل بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ نے جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت فرمایا تو کبھی آپ نے ارکانِ اسلام بیان فرما دیے جیسا کہ عبداللہ بن عمرؓ کی مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے اور کبھی آپ نے پوچھنے پر ارکانِ اسلام کی جگہ دوسرے اعمال کی طرف اشارہ فرما دیا مثلاً عبداللہ بن عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:۔

"مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں" اور مہاجر وہ ہے

Marfat.com

جس نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا جن سے خدا نے منع فرمایا ہے۔" یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ بہترین مسلم کون ہے؟ آپ نے فرمایا "وہ شخص جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

عمرو بن عتبہؓ سے بھی ایک روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "اچھی گفتگو اور کھانا کھلانا" میں نے عرض کیا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا "صبر اور فراخدلی" میں نے عرض کیا: کون سا اسلام افضل ہے؟ فرمایا "اس کا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں" میں نے عرض کیا: کون سا ایمان افضل ہے؟ فرمایا "بہترین اخلاق" میں نے عرض کیا: کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا "جو طول قنوت کی حامل ہو" میں نے عرض کیا: کون سی ہجرت افضل ہے؟ فرمایا "ان چیزوں کو چھوڑ دینا جن کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے" اس کے بعد میں نے عرض کیا: کون سا جہاد افضل ہے؟ فرمایا "اس کا جس کا گھوڑا جہاد میں مارا جائے اور خود بھی اس خون بہایا جائے" میں نے عرض کیا: کون سی ساعت افضل ہے؟ فرمایا "رات کا آخری حصہ۔"[1]

ایک دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ بات آدمی کے اسلام کی خوبی اور حسن میں سے ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔"[2]

ان احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا مقصود یہی تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے توسط سے دوسرے لوگ بھی اسلام کے حقیقی مفہوم اور ارکان اسلام کے حقیقی مقصد و منشاء سے بخوبی آگاہ ہو جائیں۔ مقام افسوس

---

[1] احمد [2] ابن ماجہ، ترمذی، بیہقی فی شعب الایمان

Marfat.com

ہے کہ ان واضح تشریحات کے باوجود آج اکثر مذہبی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ پانچ اوقات کی نمازیں پڑھ کے، تیس دن کے روزے رکھ کے، اور ٹیڑھے سیدھے زکوٰۃ و حج کے فرائض ادا کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حق اسلام ادا کر دیا، خواہ ان کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کی جان و مال، اور عزت و آبرو محفوظ نہ ہو، خواہ دیانت و امانت اور حسن اخلاق سے ان کا ہر معاملہ خالی ہو، خواہ کسی بھی لایعنی بات کو انھوں نے ترک نہ کیا ہو، اور خواہ سماج کے غربا و مساکین کی تنگ دستی اور مفلوک الحالی پر ان کا دل کبھی مضطرب نہ ہوتا ہو، لیکن پھر بھی وہ خود کو متدین اور متقی ہی سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کی نماز، روزے اور اذکار و اوراد کے گن گائیں۔

ایمان اور اسلام میں تلازم ہے

اسلام اور ایمان میں لغوی اور ظاہری فرق کے باوجود تلازم ہے یعنی ایک کے بغیر دوسرے کا وجود محال ہے۔ ان کی مثال تخم اور درخت کی سی ہے۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ موزوں آب و ہوا اور مناسب زمین میں بیج نہ ہو لیکن سطح زمین پر درخت کھڑا ہو، بعینہٖ یہی حال ایمان اور اسلام کا ہے۔ ایمان کے بغیر اسلام کا اور اسلام کے بغیر ایمان کا وجود محال ہے۔ اگر قلب میں حقیقی ایمان ہوگا تو لازماً صاحب ایمان کے افعال میں اسلام یعنی خدا کی اطاعت و بندگی کی شان جلوہ گر ملے گی، اور اگر اس کے افعال سے قدم قدم پر خدا سے بغاوت ظاہر ہو تو یہ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہوگا کہ اس کے قلب میں ایمان موجود نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی مشہور کتاب "الفقہ الاکبر" میں ایمان اور اسلام کی حقیقت یوں مذکور ہے۔

> "ایمان اقرار و تصدیق کو کہتے ہیں اور اسلام کا مفہوم خدا کے احکام کی پابندی ہے۔ گو کہ باعتبار لغت اسلام اور ایمان الگ الگ چیزیں ہیں لیکن دینی اعتبار سے ان دونوں میں تلازم پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ نہ ایمان کے بغیر اسلام پایا جا سکتا ہے اور نہ اسلام کے بغیر ایمان کا وجود ممکن ہے"[1]

---

[1] الفقہ الاکبر ص ۱۵

Marfat.com

قرآن پاک میں متعدد جگہوں پر ایمان اور اسلام کا لفظ ہم معنی استعمال ہوا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (الذاریات: ۳۶)

پس اس بستی میں جو مومن تھا ہم نے اسے نکال لیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے پوری بستی میں ایک گھر کے سوا کوئی مسلم گھر نہ پایا۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ (یونس: ۸۴)

اور موسیٰ نے کہا: اے قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم (واقعی معنوں میں) اطاعت گزار ہو۔

یہی بات ایک دوسری جگہ دعوت ایمان کے ذکر میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(آل عمران: ۸۴)

کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی، اور اس پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب کے پاس بھیجی گئی، اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو دی گئی تھی۔ ہم ان میں باہم دگر کوئی تفریق نہیں کرتے، اور ہم اسی کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

قرآن پاک میں اہل ایمان کی جو صفات مذکور ہیں، ان میں بھی ایمان اور اسلام کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝

بیشک تم لوگوں کا حامی و مددگار تو بس اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز

Marfat.com

قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (نمل: ۳)

طا ۔سین ۔یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی اس میں ہدایت اور بشارت ہے ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں مومنین انہی کو کہا گیا ہے جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور یہ آپ جان چکے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ ارکان اسلام میں داخل ہیں یہی بات ذرا زیادہ واضح الفاظ میں سورہ انفال میں یوں مذکور ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (توبہ: ۱۸)

بیشک اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے قریب ہے کہ وہ اپنے مقصود کو پالیں۔

اس آیت کا پہلا ٹکڑا یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ، حقیقت ایمان کو اور دوسرا ٹکڑا یعنی اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور خشیت خدا، حقیقت اسلام کو ظاہر کرتا ہے۔ ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے اللہ نے اپنے بندوں کو یہ بتانا چاہا ہے کہ ایمان اور اسلام میں باعتبار واقعہ کوئی دوئی نہیں ہے، اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اس پر عمل پیرا ہو گیا وہی فی الواقع ہدایت یافتہ اور کامیاب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

Marfat.com

يُنفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤمِنُونَ بِمَآ اُنزِلَ اِلَيكَ وَمَآ اُنزِلَ مِن
قَبلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُم يُوقِنُونَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّن رَّبِّهِم وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ المُفلِحُونَ ۝ (البقرہ: ۳-۵)

جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو رزق ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، اور جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو تمہارے پاس بھیجی گئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے دوسرے انبیاء کے پاس بھیجی گئی تھی۔ اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فی الواقع کامیاب و بامراد ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

تِلكَ اٰيٰتُ الكِتٰبِ الحَكِيمِ ۝ هُدًى وَّ رَحمَةً لِّلمُحسِنِينَ ۝
الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُم بِالآخِرَةِ هُم
يُوقِنُونَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّن رَّبِّهِم وَاُولٰٓئِكَ هُمُ المُفلِحُونَ ۝
(لقمان: ۲-۵)

یہ حکمت بھری کتاب کی آیات ہیں، ان نیکوکاروں کے لیے اس میں ہدایت و رحمت ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فی الواقع کامیاب و بامراد ہیں۔

ہدایت و فلاح کا حقیقی معیار

اوپر کی سطروں میں ہم نے ایمان اور اسلام میں تلازم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ہدایت اور فلاح کا ذریعہ سچا ایمان اور اللہ کے احکام کی مخلصانہ اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ اس واضح قرآنی تعلیم کے باوجود آج مسلمانوں نے ہدایت و فلاح کے بہت سے غیر قرآنی معیار بنا لیے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ آج ہر مذہبی گروہ دوسرے کو گمراہ اور جہنمی قرار دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ آج مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان اقوام کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جن کے متعلق قرآن پاک نے کہا ہے:

Marfat.com

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ

(بقرہ : ۱۱۳)

یہود کہتے ہیں کہ عیسائی گم راہ، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہود گم راہ ہیں حالانکہ دونوں ہی اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں (جس میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ہدایت یافتہ کون ہے اور گم راہ کون؟) اسی طرح کی بات وہ بھی کہتے ہیں جو اہل کتاب نہیں ہیں (یعنی ہدایت اور ضلالت کا علم نہیں رکھتے ہیں)

یہ کیسی فکر و نظر کی کج روی ہے کہ قرآن حکیم تو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان، اقامت نماز اور ایتاء زکوٰۃ کو ہدایت اور فلاح کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ لیکن مسلمان ہے کہ کسی مسلم گھر میں پیدا ہونے اور مسلمانوں کا سا نام رکھنے، کسی مذہبی فرقہ یا دینی شخصیت سے وابستگی اور کچھ دینی و سماجی اعمال و رسوم کی ادائیگی ہی کو ہدایت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ نے ایمان اور اسلام کے نام پر جدا جدا عقائد و اعمال بنا لیے ہیں۔ جو شخص ان کے خود ساختہ عقائد و اعمال کا پیرو ہے وہ ان کے نزدیک مسلمان ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

یہ خود ساختہ عقائد و اعمال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان خوفناک افتراق و انتشار کی دلدل میں گرفتار ہیں، اور ہر طرف باہمی منافرت اور بغض و عداوت کی آگ جل رہی ہے۔ مسلمان یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ بغض و عداوت کی یہ آگ صرف اسی صورت میں ٹھنڈی ہو سکتی ہے جب وہ اپنے خود ساختہ عقائد و اعمال کو ترک کر کے قرآن کے معیار ہدایت و فلاح کو صدق دلی کے ساتھ مان لیں۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، ہدایت اور فلاح کا معیار یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور یوم آخرت پر یقین ہو اور قیام نماز اور ایتاء زکوٰۃ کے فرض کو اس کے جملہ تقاضوں کے ساتھ ادا کیا جائے، نیز زندگی کے ہر معاملے میں خدا اور اس کے رسول کے احکام و ہدایات کے مطابق حتیٰ الوسع عمل کیا جائے۔ اسی کا نام حقیقی ایمان اور اسلام ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر وہ خدا کی خوشنودی اور اس کی رحمت

Marfat.com

کے مستحق ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (توبہ: ۷۱)

اور مومن عورتیں اور مومن مرد تو ایک دوسرے کے رفیق اور دمساز ہوتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ اللہ ان پر عنقریب اپنی رحمتیں نازل کرے گا بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔

اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے بعد "یطیعون اللہ ورسولہ" کا جملہ صاف بتا رہا ہے کہ ایک مومن کی اطاعت صرف اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ اطاعت کے دائرہ سے اس کی زندگی کا کوئی عمل بھی خارج نہیں ہوتا ہے یہی اطاعتِ کامل ہے جس کے نتیجے میں مومنین پر اللہ کی رحمت و بخشش کا نزول ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں جو جگہ جگہ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کا جملہ ملتا ہے تو اس سے مومنوں کو یہی بتانا مقصود ہے کہ ایمان کے بعد اطاعت سے روگردانی ایمان کے منافی ہے۔ ایک مومن کا وصف ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وہ ایمان اور اطاعت (اسلام) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جہاں اسے خدا اور اس کے رسول کا کوئی حکم ملا وہ فوراً اس پر لبیک کہتا ہوا اس کو بجا لاتا ہے۔ عہدِ رسالت کے مومنین کا یہی حال تھا جیسا کہ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڶ (بقرہ: ۲۸۵)

رسول کے پاس اس کے رب کی طرف سے جو کچھ بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان رکھتا ہے اور اہلِ ایمان بھی، ان میں سے ہر ایک اللہ، اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے

رسولوں پر بغیر کسی تفریق کے ایمان رکھتا ہے اور (ان کی زبان پر) یہی صدا ہوتی ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جو شخص خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے لیکن ان کے حکموں کو سن کر ان پر عمل کی کوشش نہیں کرتا وہ قرآن کے نزدیک مومن نہیں ہے خواہ وہ زبان سے محبت رسول کی کتنی ہی باتیں کیوں نہ کرے۔ ارشاد ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (نور: ۴۷)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت قبول کرلی لیکن اس ایمان و اطاعت کے اقرار کے بعد بھی وہ (احکام پر عمل کرنے سے) گریز کرتے ہیں اور یہ مومن نہیں۔

ایک مومن کے سمع وطاعت کا حال قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (نور: ۵۱)

جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے تو ایمان والوں کی صدا یہی ہوتی ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی یہی لوگ فی الواقع کامیاب و بامراد ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے کے بعد ان کے احکام سے روگردانی کرنا کسی مومن حقیقی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ یہ طرز عمل تو صرف فی سقول اور منافقوں کا ہے۔ ایک حکم عدولی تو یہ ہے کہ آدمی منہ سے کہہ دے کہ وہ فلاں حکم کو نہیں مانتا یہ صریح سرکشی بلکہ کفر ہے۔ اور دوسری حکم عدولی یہ ہے کہ آدمی زبان سے تعمیل حکم سے انکار تو نہ کرے لیکن عملاً وہ کام کرے جو خدا اور اس کے رسول کے حکم کے بالکل خلاف ہو۔ اسی کا نام اصطلاح قرآن میں فسق ہے اور ایسا کرنے والے کو وہ فاسق قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اس طرز عمل سے روکا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا

Marfat.com

عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۚ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (انفال: ۲۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور جب رسول تم کو بلائے تو سن کران سنی نہ کرو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ سنا پر سنتے نہیں (یعنی حکم خدا و رسول سن کران کو بجا نہیں لاتے)

صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے ۲۵ سال کے مختصر زمانہ میں جو مہتم بالشان کامرانیاں حاصل کیں، اور روم و ایران جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قدموں پر جھکنے کے لیے مجبور کر دیا تو اس کی وجہ صرف اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان اور عمل و اطاعت کی زندگی تھی، اور آج ہم جو دنیا میں کثرتِ تعداد کے باوجود ہزیمت خوردہ اور پست و ذلیل ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ ہم ایمان اور اطاعت کی حقیقی روح سے محروم ہو چکے ہیں۔ عقائد میں ہماری اکثریت کسی نہ کسی پہلو سے شرک کی حدوں کو چھو رہی ہے، اور اعمال کے اعتبار سے ہم دورِ رسالت کے منافقوں کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔ وہ اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے اقامت نماز اور ایتاءِ زکوٰۃ کا فریضہ انجام دیتے تھے لیکن آج ہمارے ایمان کا یہ حال ہے کہ ہماری اکثریت اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ سے جو ہماری اجتماعیت، سماجی مساوات، تنظیم و اتحاد، معاشرتی خوشحالی اور تزکیۂ نفس کے بہترین ذرائع ہیں، عملاً بے پروا ہو چکی ہے، اور جہاں کہیں صلوٰۃ و زکوٰۃ کا اہتمام ہے بھی تو وہ بالعموم ایک بے روح ڈھانچہ ہے اور زندگی کے تمام معاملات اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر ہیں۔

مسلمان یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی و سربلندی کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ خدا کی خالص اطاعت و بندگی اور حسنِ عمل کا راستہ ہے۔ اس راستے کے سوا جو راستہ بھی ہے وہ ضلالت و خسران کی راہ ہے، اس پر چلنے کا نتیجہ دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں دردناک عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

درجاتِ ایمان

ہمارے اکثر علماء نے ایمان کی قسمیں بیان کی ہیں، لیکن ہماری حقیر فہم کے مطابق ایمان ناقابلِ تقسیم ہے۔ انسان کے قلب میں یا تو یقین ہوگا یا انکار یا شک، پہلے کا نام ایمان، دوسرے

Marfat.com

کا کفر، اور تیسرے کا نفاق ہے۔ اسی بنیاد پر انسانوں کی بھی تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔ مومن، کافر اور منافق۔ ہدایت کے پہلو سے قرآن نے بھی انسانوں کو انھیں تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ان کو بالترتیب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ۤ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرہ: ۳-۵)

جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق بھی ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل ہوئی، اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے ہدایت یافتہ اور کامیاب ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ ۭ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ ز وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (البقرہ: ۶، ۷)

جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کو تم (انجام کار سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر (ان کے افعال بد کی وجہ سے) مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی پڑی ہوئی ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں درآنحالیکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ مگر اس کو سمجھتے نہیں۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کے نقطۂ نظر سے انسانوں کی قسمیں تو ہو سکتی ہیں لیکن خود مومن کی کوئی تقسیم نہیں ہو سکتی، وہ ناقابل تقسیم ہے۔ البتہ ایمان کے مختلف درجات ضرور ہیں۔ ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے ذہنی اعتبار سے ایک حالت پر پیدا نہیں کیا ہے۔ اور طبائع اور استعدادوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے یقین واطاعت کی حالت بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ یقین واطاعت میں اس فطری فرق کے نتیجے میں ایمان کے تین درجات متعین ہوتے ہیں۔

ایمان کا پہلا درجہ زبان سے اقرار وتسلیم کرنے اور اعضاء سے عمل کرنے کا ہے، اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اس درجہ میں بالعموم ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ اشخاص پائے جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دل میں کوئی شک ہوتا ہے بلکہ علم کی کمی کی وجہ سے وہ یقین جو ہونا چاہیے، اس سے محروم ہوتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ اقرار لسانی کے بعد ظاہری طور پر اسلامی زندگی گزارتے ہیں یعنی کم از کم ارکان اسلام پر حتی المقدور عمل کرتے ہوں تو وہ بلاشبہہ مسلمان کہے جائیں گے اور انھیں مسلمانوں کی جماعت کا ایک فرد سمجھا جائے گا۔ اگر اقرار لسانی کے بعد وہ ارکان اسلام پر عمل نہ کریں تو ان کا شمار فساق کے زمرے میں کیا جائے گا۔ اس پہلے درجہ کے متعلق جس کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ایمان کی ایک قسم قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

> "شارع نے ایمان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جس پر احکام دنیا کا مدار ہے جیسے جان ومال کا محفوظ ہونا، اور اس کا انضباط ایسے امور سے کرنا جن میں فرماں برداری ظاہر ہوتی ہے، اور وہ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو بجز حق اسلام کے وہ اپنی جانوں اور مالوں کو مجھ سے محفوظ کریں گے اور (جو کفر ومعاصی وہ پوشیدہ طور پر کریں گے) خدا ان سے ... لے گا" اور

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص ہماری سی نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ سمجھے اور ہمارے ہاتھوں کا ذبیحہ کھائے تو یہ وہ مسلمان ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا معاہدہ ہے پس تم لوگ اللہ کے معاہدہ میں خیانت نہ کرنا۔"[1]

اس اقتباس اور اس میں مندرج حدیث سے واضح ہو گیا کہ ایمان کا کم سے کم درجہ یہی ہے کہ آدمی اللہ کی معبودیت اور وحدانیت اور رسول کی رسالت پر ایمان لا کے، نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے، اور اعمال و رسوم میں مسلمانوں جیسا طرز عمل اختیار کرے۔ اگر وہ اتنا کر لیتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور اس کے باقی معاملات اللہ کے سپرد ہیں۔

ایمان کا دوسرا درجہ یقینِ قلب کا ہے۔ یہ ایمان کا نہایت ہی بلند درجہ ہے۔ اور تمام صلحاء و اتقیا اور علماء خیر اسی درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ اس درجہ میں یقین قلب کے ساتھ ساتھ کامل درجہ کا تسلیم و انقیاد بھی پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ایمان کے حاملین کو مومن صادق قرار دیا ہے، فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات: ۱۵)

بیشک مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہ کیا اور راہ خدا میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ (اپنے دعوئ ایمان میں) سچے ہیں۔

ایمان کا تیسرا درجہ اطمینانِ قلب کا ہے۔ اطمینان اور طمانیت اس سکون اور ٹھہراؤ کو کہتے ہیں جو مشقت اور کوفت کے بعد حاصل ہو۔ ایمان کے بعد ایک مرتبہ سکون قلب کا آتا ہے جس کے حصول کے بعد وہ ہر طرح کے وساوس اور شکوک سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے گویا قلب ایک ایسے نقطہ پر آکر ٹھہر جاتا ہے جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اسے ادھر سے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، من ابواب الایمان، ص ۱۶۰ طبع بیروت

Marfat.com

اُدھر نہیں کر سکتی۔ اس مرتبۂ ایمان کو اصطلاحِ قرآن میں عین الیقین کہا جاتا ہے۔ اس طرح کا ایمان انبیاء و رسل اور شہداء و صدیقین کا درجہ بدرجہ ہوتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسرارِ فطرت کا ہر پردہ اٹھنے لگتا ہے اور مومن کا قلب، یقین و اطمینان کے انوار و تجلیات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ پر پہنچنے کے بعد اس کا ہر انداز معصومانہ اور اس کی ہر ادا دلبرانہ ہو جاتی ہے۔

اس مرتبہ و مقام کی تین مثالیں ہم کو قرآنِ پاک میں ملتی ہیں۔ پہلی مثال کا تعلق بنی اسرائیل کے ایک نبی سے ہے۔ قرآن نے نام کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی دانیال، حجی اور عزیر علیہم السلام میں سے کوئی ایک تھے۔ ان کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (بقرہ: ۲۵۹)

ایک مثال اس شخص کی بھی ہے جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے سقف و بام شکستہ ہو کر گر چکے تھے۔ بستی کی اس حالت کو دیکھ کر وہ کہنے لگا کہ یہ بستی جو مردہ و ویران ہو چکی ہے اسے کس طرح اللہ دوبارہ نئی زندگی بخشے گا۔ (یعنی آباد کر دے گا) پس اللہ نے اسے ۱۰۰ سال تک حالت موت میں رکھا پھر اسے زندہ کیا اور پوچھا کہ کتنے دنوں تک تم اس حالت میں رہے ہو؟ اس نے عرض کیا: بس یہی کل ایک دن یا نصف دن، اس نے کہا: نہیں تم ۱۰۰ سال تک اسی حالت میں رہے ہو۔ (اگر تم کو یقین نہیں تو) ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ بالکل محفوظ حالت میں ہیں، اور اپنے گدھے کی طرف دیکھ (جو گل سڑ چکا ہے) ہم تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں، اور اب گدھے کی ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ کس طرح

ہم اس کی ہڈیوں کو ترکیب دیتے ہیں پھر اس پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت حال کھل گئی تو وہ پکار اٹھا: بیشک میں سمجھ گیا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس واقعہ سے بنی پر یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ جو خدا ایک آدمی کو سو سال تک حالتِ موت میں رکھنے کے بعد دوبارہ زندہ کرسکتا ہے۔ اور گدھا جو صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا دوبارہ اس کے انجر پنجر درست کرکے اس کو پھر زندہ کھڑا کرسکتا ہے۔ اس خدا کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہیں کہ وہ مردہ بستیوں اور شہروں کو دوبارہ زندہ یعنی آباد کردے۔ چنانچہ یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوگئی اور ٹھیک سو سال کے بعد بیت المقدس دوبارہ آباد و تعمیر ہوگیا۔ دوسری مثال کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۚ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۚ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (بقرہ: ۲۶۰)

اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے ہمارے رب تو ہمیں دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، اس کے رب نے کہا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ اس نے کہا: کیوں نہیں، البتہ (مشاہدہ عینی کے ذریعہ) اطمینان قلب کا طالب ہوں۔ اس (رب) نے کہا: اچھا تو چار پرندے لے لو اور ان کو اپنے سے مانوس کرلو پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہر پہاڑ پر ایک ٹکڑا رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو پکارو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ بڑی قدرت والا اور حکمت والا ہے۔

تیسری مثال کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے:۔

قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۚ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (اعراف: ۱۴۳)

"اس نے (موسیٰ) کہا: اے میرے رب تو مجھے اپنی ایک جھلک دکھادے۔ اس نے کہا: تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر وہ اپنی جگہ ثابت و قائم رہا تو تم مجھے یقیناً دیکھ لوگے۔ پس جب

Marfat.com

اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو عرض کیا: بے شک تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے۔ میں (اپنی جرأت دید پر) تیری جناب میں معذرت خواہ ہوں اور میں سب سے پہلے اس (حقیقت الحقائق) پر یقین کرنے والا ہوں۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح اپنے نیک بندوں کو یقین سے عین الیقین کی منزلوں تک لے جاتا ہے، اور ان پر حقیقت حال کھول کر ان کے قلب و دماغ کو روشنی عطا کرتا ہے۔ اس فضل و کرم سے اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو نوازتا ہے جن کے متعلق اس نے کہا ہے:-

قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ۝ (رعد: ۲۷)

کہہ دو کہ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے (اس کے افعال کے سبب) گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اس کی طرف طلب ہدایت کے لیے رجوع کرتا ہے، اسے راہ ہدایت دکھاتا ہے۔

ہم نے سطور بالا میں ایمان کے جن تین درجات کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

"عرفان حقیقت کے لحاظ سے یہاں تین مرتبے ہوئے۔ پہلا مرتبہ اسلامی دائرہ کے عام اعتقاد و عمل کا ہے یہ اسلام ہے یعنی جس نے اسلامی عقیدہ کا اقرار کر لیا اور اس کے اعمال کی زندگی اختیار کر لی وہ اس کے دائرہ میں آ گیا۔ لیکن دائرہ میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ علم و یقین کے جو مقامات ہیں وہ بھی ہر وارد و داخل کو حاصل ہو گئے۔ پس اب دوسرا درجہ نمایاں ہوتا ہے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسلام ظاہر کا اقرار و عمل تھا، ایمان دل و دماغ کا یقین و اذعان ہے۔ یہ مرتبہ جس نے حاصل کر لیا وہ عوام سے نکل کر خواص کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔ لیکن معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ عرفان حقیقت اور عین الیقینی ایقان کا ایک اور مرتبہ باقی رہ جاتا ہے اسے احسان سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن یہ مقام محض یقین اور اعتقاد پیدا کر لینے کا نہیں ہے جو ایک گروہ کو بحیثیت گروہ کے حاصل ہو سکتا ہے یہ ذاتی تجربہ کا مقام ہے جو یہاں تک پہنچ جاتا ہے وہ اپنے ذاتی تجربہ و کشف سے یہ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیمی اور احکامی عقائد میں داخل نہیں۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے تبلانے اور سمجھانے کا نہیں۔ جو یہاں تک پہنچ گیا وہ اگر کچھ تبلائے گا بھی تو یہی کہ میری طرح بن جاؤ پھر جو کچھ دکھائی دیتا ہے دیکھ لو۔"[۱]

ایمان کا وہ مرتبہ و مقام جس پر صدر اول کے مسلمانوں کی اکثریت فائز تھی یہی یقین و اطمینان کا مرتبہ تھا۔ ان کے قلوب و اذہان یقین و اطمینان سے اس طرح لبریز تھے کہ مصائب

---

[۱] ترجمان القرآن تفسیر سورہ فاتحہ جلد اول ص ۲۲۲، ۲۲۳

آلام کے طوفان اور تعذیب وتشدد کی آندھیاں بھی ان کی شمع ایمان کو گل نہ کرسکیں۔ انھوں نے اپنی جان عزیز، جاں آفریں کے سپرد کردی لیکن ایمان سے دست برداری گوارہ نہ کی۔ اعزا واقارب، بیوی بچے، مال وتجارت اور مکان ووطن کی محبت کو ایمان کی محبت پر یوں قربان کر دیا جیسے یہ بے وقعت چیزیں تھیں۔ یہ جذبۂ خلوص وایثار ان کے اندر پیدا نہیں ہوسکتا تھا اگر حلاوت ایمان سے ان کے قلوب واذہان آشنا نہ ہوتے۔ میکدۂ علم ویقین کے جرعہ خوار بن جانے کے بعد ہی وہ اوہام واساطیر کے جام ومینا کو چکنا چور کر سکے۔ ان کی زندگیاں یقین محکم، عمل صالح اور خدا اور اس کے رسول کی محبت واطاعت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ انھوں نے کہہ دیا کہ خدا ایک ہے تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی انھیں آستان غیر پر جبہ سائی کے لیے مجبور نہ کرسکی۔

ایک یہ مسلمان تھے اور ایک ہم ہیں کہ یقین واطمینان کا مرتبہ ومقام تو درکنار حقیقی معنوں میں مسلم بھی نہ رہے۔ مسلم کے معنی تو فرماں بردار کے ہیں، لیکن ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ ہمارے قلوب واذہان حرارتِ ایمان سے خالی اور اعمال حسن کردار سے محروم ہیں۔ ہم غیر اسلامی رسوم ورواج اور ایمان کش بدعات وخرافات کے دام ہم رنگ زمیں میں مکمل طور پر گرفتار ہیں۔ مختصر یہ کہ ہماری زندگیوں کو دور اوّل کے مسلمانوں کی زندگیوں سے دور کی بھی کوئی نسبت نہیں ہے۔ خوش فہمی اور خود فریبی کی بات دوسری ہے۔ یہ حقیقی ایمان اور اسلام سے بے اعتنائی اور مشرکانہ افعال ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم محکومیت اور ذلت ورسوائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اور اس حالت پر اس طرح قانع ومطمئن ہیں گویا مومن غلامی کے لیے اور کافر وشرک حکم رانی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایمان میں کمی وبیشی کا مسئلہ

ایمان میں کمی وبیشی بھی ہمارے یہاں ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ

Marfat.com

ایمان کے اندر کمی وبیشی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایمان جن اجزا سے مرکب ہے ان پر ہر شخص کا ایمان برابر ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اسی بات کے قائل ہیں۔ ابن البزازی نے اپنی المناقب میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"ایمان خواہ آسمان والوں کا ہو اور خواہ زمین والوں کا، برابر ہے۔ اوّلین و آخرین اور انبیا و رسل کا ایمان بھی یکساں ہے کیونکہ ہم سب خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں۔ اور فرائض بہت قسم کے ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ جو سب کے لیے ہے۔ اسی طرح کفر بھی یکساں ہے گو کہ کافروں کی بہت قسمیں ہیں۔ انبیاء جن چیزوں پر ایمان لائے ہم بھی اُن پر ایمان رکھتے ہیں البتہ ثواب اور طاعات میں ان کو ہم پر برتری حاصل ہے۔"

امام بخاری اس نقطۂ نظر کے شدید مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی "صحیح" میں کسی ایسے آدمی کی روایت نہیں لی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ایمان قول و فعل سے مرکب نہیں، اور اس میں کمی وبیشی نہیں ہوتی۔

ایمان میں کمی وبیشی کے مسئلہ میں یہ دو مختلف نقطۂ نظر کیوں وجود میں آئے؟ اس پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف ایمان کی بالکل قانونی تعریف کی جارہی ہے اور دوسری طرف اس کی حقیقی اور معنوی توجیہ۔ جو لوگ ایمان کو صرف تصدیق قلبی اور اقرار لسانی سے مرکب قرار دیتے ہیں ان کی نظر میں ایمان میں کوئی کمی وبیشی واقع نہیں ہوتی اور اس اعتبار سے یہ درست بھی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ دل میں تصدیق بھی ہو اور تکذیب بھی یہ ناممکن ہے۔ تصدیق نام ہی ہے ایسی باطنی کیفیت کا جس میں تکذیب کا شائبہ نہ ہو۔ اور اگر واقعۃً تصدیق کے ساتھ تکذیب بھی شامل ہے تو یہ شک کے ہم معنی ہے اور تصدیق کے ساتھ شک کا اجتماع محال ہے۔ کسی بھی تصدیق میں کمی کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں شک شامل ہو اور شک کے شامل ہوتے ہی تصدیق باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دل میں یا تو جھوٹ ہوگا یا شک یا سچ۔ پہلی دونوں صورتیں کفر اور نفاق کے درجہ میں آتی ہیں، صرف آخری صورت

Marfat.com

کو ایمان کہتے ہیں اور اس میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔

جو لوگ تصدیق اور اعمال کے مجموعہ کو ایمان کہتے ہیں ان کے نزدیک ایمان میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور یہ بات بھی درست ہے، کیونکہ عمل میں کمی و زیادتی ایک بدیہی بات ہے۔

ہمارے نزدیک صحیح نقطۂ نظر یہی ہے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ ایمان کے معنی تصدیق ہی کے نہیں بلکہ ایقان کے بھی ہیں جیسا کہ ہم ایمان کے لغوی مفہوم کی وضاحت میں بیان کر چکے ہیں۔ اگر ایمان کو ایقان کے معنی میں لیا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ ایقان میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ ایقان علم ہی کے مرادف ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ علم میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان علم سے وجود پاتا ہے اور عمل سے اس کی تکمیل ہوتی ہے چنانچہ ہر علم نافع اور عمل صالح سے اس میں افزائش ہوتی ہے؛ اور ہر علم غیر نافع اور عمل غیر صالح سے اس کے اندر کمی واقع ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بیج کی نشوونما کے لیے مٹی، پانی اور موزوں ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایمان کے نشوونما کے لیے قلب سلیم، علم نافع اور عمل صالح درکار ہوتا ہے۔ بیج کو اگر مناسب مٹی، وافر پانی اور موزوں ہوا نہ ملے تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر ایمان کو قلب بیدار علم نافع اور عمل صالح کی آغوش نہ ملے تو وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے۔

ایمان کا تعلق خبر اور نظر دونوں سے ہوتا ہے۔ جب خبر کے ساتھ نظر کا تیقن بھی شامل ہو جاتا ہے تو پھر ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ خبر کا تیقن قرآن حکیم کے مسلسل مطالعہ اور اس میں غور و تدبر سے حاصل ہوتا ہے، اور نظر کا تیقن آثار کائنات کے مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ آثار کائنات کا ہر مشاہدہ شاہد کی نظر میں عین الیقین کی شمعیں جلاتا ہے اور "خبر" کی تصدیق کرتا ہے، اور یہی ایمان کی زیادتی ہے۔ جو شخص قرآن حکیم میں فکر و تدبر کا عادی نہیں ہے اور آثار کائنات کا مشاہدہ بھی نہیں کرتا اس کے قلب و نظر معرفت حق کے جلووں سے صحیح معنوں میں آشنا نہیں ہوتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ایمان میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور افسردگی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ہم ایمان میں کمی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

بہرحال علم کے بڑھنے سے ایمان بڑھتا ہے جب کہ اس کے ساتھ عمل صالح کا نور بھی ہوتا ہے، اور علم کے گھٹنے سے ایمان گھٹتا ہے جب اس کے ساتھ اعمال غیر صالحہ بھی شامل ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ اعمال غیر صالحہ کی کثرت ایک مومن کے قلب کو سخت اور بے نور کر دیتی ہے:

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ (آل عمران: ۱۶۷)

وہ آج ایمان کے مقابلے میں کفر سے زیادہ قریب تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان ہر حالت میں یکساں کیفیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ مختلف حالات کے تحت اس کے اندر تغیر و تفاوت ہوتا رہتا ہے امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"اس صورت میں کہ لفظ ایمان کے معنوں میں عمل بھی داخل ہو تو ظاہر ہے کہ اعمال سے اس میں کمی و بیشی ضرور ہوگی، اور یہ بات کہ اس کی تاثیر اس ایمان میں بھی ہوتی ہے کہ نہیں جس کو صرف تصدیق کہتے ہیں اس میں اختلاف ہے اور ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس میں بھی تاثیر ہوتی ہے۔ تیسرا اطلاق یہ ہے کہ ایمان سے مقصود وہ تصدیق یقینی ہو جو کشف اور شرح صدر اور نور بصیرت کے مشاہدہ کے طور پر ہو۔ یہ قسم دوسری اقسام کی نسبت زیادتی اور کمی سے بے نیاز ہے۔ تاہم ہمارا قول یہ ہے کہ وہ امر یقینی جس میں شک نہ ہو اس میں بھی نفس کا اطمینان مختلف ہوا کرتا ہے، مثلاً ایک بات یہ ہے کہ دو ایک سے زیادہ ہے، اور دوسرے یہ کہ عالم مخلوق اور حادث ہے ہر چند ان دونوں میں سے کسی میں بھی شک نہیں مگر جیسا اطمینان پہلی بات پر ہے ویسا دوسری بات پر نہیں ہے۔ یہی حال دوسرے تمام یقینی امور کا ہے کہ اگرچہ وہ واضح ہوتے ہیں مگر ان پر نفس کے اطمینان کی حالتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے باب میں اسلاف کا نقطۂ نظر ہی درست ہے۔"[1]

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ ص ۱۰۷ (مطبع نول کشور)

Marfat.com

قرآن پاک کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے
مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ۝ (محمد: ۱۷)

اور جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا ان کی ہدایت (سوجھ بوجھ) اللہ نے زیادہ کی اور ان کو ان کا تقویٰ بخشا۔

دوسری جگہ آیا ہے:

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (توبہ: ۱۲۴)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ تم میں سے کس کا ایمان اس (سورہ) نے زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا ایمان اس نے یقیناً زیادہ کیا، اور وہ اس سے خوش ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۚ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ (احزاب: ۲۲)

اور جب مومنین نے جنگ آزما گروہوں کو (بالمقابل) دیکھا تو کہا: یہ تو وہی چیز ہے جس کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ فرمایا تھا، اور سچ کہا اللہ اور اس کے رسول نے، اور اس سے ان کا ایمان (یقین) اور تسلیم (جذبۂ اطاعت) اور بڑھ گیا۔

ان آیات قرآنی سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان ہر حال میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ مومنین کی ایمانی حالت کے لحاظ سے یہ گھٹتا بڑھتا ہے، اور یہی مذہب حق ہے۔

امام ابوحنیفہؒ ایمان میں کمی اور بیشی کو اگر تسلیم نہیں کرتے ہیں تو اس کی بھی ایک وجہ ہے اور اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ امام صاحب فقیہہ (قانون داں) بھی تھے اور قاضی (منصف) بھی۔ انھوں نے ایمان میں کمی اور بیشی کا جائزہ بالکل ایک قانون داں اور قاضی کی حیثیت سے لیا۔ ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ایمان قول و عمل دونوں کا نام ہے یا محض قول کا۔ ظاہر ہے کہ ایک قانون داں کے زاویۂ نگاہ سے ایمان صرف قول سے عبارت

Marfat.com

ہوگا، کیونکہ قول کسی کمی بیشی کا محل نہیں ہو سکتا جب کہ عمل میں مختلف احوال وکوائف کے تحت کمی وبیشی ہوتی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس مسئلہ پر بہت عمدہ بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

"امام ابو حنیفہ نے اس مسئلہ کو بالکل اس نگاہ سے دیکھا جس نگاہ سے ایک قاضی اور فقیہ ان مسائل کو دیکھتا ہے یا جس نگاہ سے امیر اسلام، وراثت ونکاح اور خراج وجزیہ وغیرہ کے معاملات اور سیاسی مسائل کے فیصلے کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ شخص مومن ہوگا جو اقرار کرے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے، اور مسلمانوں کے شعار اور ان کے ظاہری حالات میں ان کے طریقہ پر ہو۔ ایسے اشخاص کے متعلق یہی حکم لگایا جائے گا کہ یہ مسلمان ہیں۔ ان میں صادق وکاذب اور متقی وفاجر کی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس قانونی ایمان میں سب برابر ہوں گے، اس میں کمی وبیشی واقع نہیں ہوتی، کیونکہ قانون اور سیاست کی نگاہ خدا اور بندے کے درمیان کے باطنی احوال و معاملات کی جستجو نہیں کرتی۔ یہ معاملات تو صرف روز قیامت بے نقاب ہوں گے (دیکھئے سورہ الحدید)

اس سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی کی نظر میں ایمان سے صرف وہ ایمان مراد ہوتا ہے جو ہماری عدالتوں میں احکام قضا کے اجراء ونفاذ کی بنیاد بن سکے۔ اس کو ایمان کی حقیقت، اس کے اجزائے ترکیبی اور اس کی ظاہری و باطنی خصوصیات سے کوئی بحث نہیں ہوا کرتی۔ اب اگر قرآن ایمان میں کمی اور زیادتی کی بات کرتا ہے تو اس تصریح کا اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے اور قرآن اس سے ایک بالکل ہی مختلف بات کہتا ہے"[1]

صفات مومن

اس کائنات ہستی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کچھ مخصوص خصائص اور صفات نہ

---

[1] تفسیر سورہ العصر ص ۳۶، ۳۹۔

Marfat.com

رکھتی ہو۔ انھیں خصائص کی بنیاد پر ہم نہ صرف اس چیز کی اصلیت و ماہیت کا ادراک کرتے ہیں بلکہ اسے دوسری اشیاء سے ممتاز بھی کرتے ہیں۔ یہ خصائص بعض تو خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض داخلی نوعیت کے۔ ایک سیب کو لے لیجئے۔ یہ کچھ ظاہری صفات مثلاً مخصوص شکل وصورت، وضع و سائز اور رنگ و بو، اور کچھ باطنی صفات مثلاً جوہر اور مزہ کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم سیب کی ان ظاہری اور باطنی صفات مخصوصہ سے واقف ہوں اور پھر بھی پھلوں کے ڈھیر میں سے ایک سیب کو نکال نہ لیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اشیاء کا تصور ان کی صفات سے وابستہ ہے۔ ہم جب بھی ایک سیب کا تصور کریں گے لازماً ہمارے ذہن میں اس کی ظاہری و باطنی صفات ہی آئیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اشیاء کا علم ان کے صفات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ہم صفات سے ہٹ کر ان کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے ہیں۔

یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ ہر انسان کچھ ظاہری اور کچھ باطنی اوصاف رکھتا ہے۔ یوں تو جوہر انسانیت کے اعتبار سے ہر انسان یکساں ہے، لیکن ظاہری اور باطنی خصائص کے اختلاف کی وجہ سے ہر انسان کی حیثیت جداگانہ ہے۔ انھیں جداگانہ حیثیتوں کی بنا پر ہم ایک انسان کو دوسرے سے علٰحدہ تصور کرتے ہیں۔ ایک شاعر اور غیر شاعر، ایک سرمایہ دار اور اشتراکی، ایک جمہوریت پرست اور مطلق العنان انسان کے درمیان جو چیزیں خطِ امتیاز کھینچتی ہیں وہ ظاہری اور باطنی خصائص و اوصاف ہی تو ہیں ورنہ باعتبار جوہر انسانیت وہ سب برابر ہیں۔ ہم کسی ایسے آدمی کو شاعر نہیں کہہ سکتے جو شعر گوئی کی ایک مخصوص وضع و انداز نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہم کسی ایسے شخص کو اشتراکی نہیں کہہ سکتے جو ایک مخصوص طرزِ فکر اور طرزِ عمل کا مالک نہ ہو یعنی جس کے ذہن و دماغ پر طبقاتی کشمکش اور معاشی تصورات کا ہی غلبہ ہو۔

یہی حال ایک مومن و کافر کا بھی ہے۔ دونوں میں باعتبار انسانیت کوئی فرق نہیں لیکن پھر بھی ہم ایک کو مومن اور دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ دونوں کا مطمح نظر، اندازِ فکر اور طرزِ زندگی جداگانہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مومن و کافر کے

درمیان حقیقی وجہ امتیاز چند اوصاف وخصائص ہیں۔ یہ اوصاف کیا ہیں ان کو جان لینا ضروری ہے۔

قرآن پاک میں ایک صادق ومخلص مومن کی صفات کو متعدد جگہوں پر مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان صفات کے آئینہ میں ایک راست باز مومن کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، اور ہم اس تصویر کی مدد سے ایک مومن اور غیر مومن میں فرق وامتیاز کر سکتے ہیں۔ ہم بیان اختصار کے ساتھ ان صفات حسنہ کا ذکر کریں گے جو ایک حقیقی مومن کی امتیازی صفات کہی جا سکتی ہیں۔

یقین محکم اور جہد وایثار

قرآن مجید، یقین محکم، جہد مسلسل، اور ایثار جان ومال کو ایک مومن کی نمایاں اور امتیازی صفات قرار دیتا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝ (حجرات: ۱۵)

حقیقی مومن تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے، اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں سے اور اپنے مالوں سے جہاد کیا۔ دراصل یہی لوگ سچے ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک سچا مومن وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو صرف زبان ہی سے نہیں مانتا بلکہ دل کے کامل یقین کے ساتھ مانتا ہے۔ اس کے دامن یقین میں ریب وشک کا کوئی کانٹا پیوست نہیں ہوتا، اور نہ ذہن وفکر کے آئینہ پر تردد کا خفیف غبار موجود ہوتا ہے۔ وہ یقین کی ایک ایسی مضبوط چٹان ہوتا ہے جس کو ریب وگمان کی کوئی تیز وتند آندھی اپنی جگہ سے متزلزل نہیں کر پاتی۔

اس یقین محکم کا عملی مظاہرہ ایثار جان ومال کی صورت میں ہوتا ہے۔ خواہ کوئی بھی

Marfat.com

نظریۂ زندگی ہو، اگر اس پر ایمان رکھنے والا شخص اس نظریہ کے غلبہ واشاعت کے لیے جان و مال کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا ہے تو اس کے صادق ومخلص ہونے میں بھلا کس کو شک ہو سکتا ہے؟

ایک مومن صادق کی زندگی بھی یقین واثق، جہد وعمل اور ایثار جان و مال کا ایک دل کش و دل آویز مرقع ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک خدا کی راہ میں، اس کے کلمہ کی سربلندی اور اس کے نام کی عظمت وسرفرازی کے لیے اپنے مال سے، اپنی جان سے اور اپنے دماغ کی ساری قوتوں سے مصروفِ تگ وتاز ہوتا ہے۔ وہ خانقاہیت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار نہیں کرتا بلکہ ایک مرد جاں باز کی طرح رزم گاہِ حیات میں ستیزہ کار رہتا ہے بقول اقبال ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں   اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

قرآن نے ایک مومن صادق کی جو تصویر پیش کی ہے یعنی یقین راسخ، جہد وعمل اور جان و مال سے قربانی، یہی تین چیزیں ایک سچے مومن کی زندگی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دنیا میں کسی نظریے کو فتح و غلبہ صرف انھیں تین باتوں سے مل سکتا ہے۔ اگر کسی نظریۂ زندگی کے ماننے والے ان تین صفتوں سے عاری ہیں تو یقین کر لیجیے کہ نامرادی اور خجالت اُن کا مقدر ہے، اور ایسا نظریۂ زندگی کبھی انسانی سماج پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔

یہی تین صفتیں تھیں جن سے صحابہ کی زندگیاں آراستہ تھی اور انھیں کے ذریعہ انھوں نے ہر غلبہ وکامرانی حاصل کیا۔ آج ان صفتوں سے مسلمانوں کی زندگیاں تہی دامن ہو چکی ہیں۔ ایمان کی ظاہری صورتیں تو آج مل جاتی ہیں، لیکن یقین محکم، عمل اور قربانی کی صفتیں کہاں؟ آج ان کی جستجو بھی بیکار ہے۔ یقین کی جگہ شک اور تردد، عمل کی جگہ بے حسی اور جمود، اور جاں کوشی وسرفروشی کی جگہ زمانہ سازی وکم ہمتی نے لے لی ہے اور بہتوں نے خانقاہوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے، غلامی، ذلت وخواری اور غربت ومسکنت آج ہمارا مقدر بن چکا ہے۔

Marfat.com

اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ

جن صفات ثلاثہ کا ہم نے اوپر کی سطروں میں ذکر کیا ہے، ایک مومن کی زندگی میں ان کی اوّلین نمود، ترقی اور استحکام جن ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے ان میں نماز اور زکوٰۃ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

قرآن پاک میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر مومن کی ان دو صفتوں یعنی نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ملتا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ (نمل: ۱-۳)

طٰسٓ، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔ ہدایت اور بشارت ہے ان مومنین کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (السجدۃ: ۱۵، ۱۶)

بیشک ہماری آیات پر وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں کہ جب ان کے ذریعہ انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سن کر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے، ان کے پہلو خوابگاہوں سے علحدہ ہوتے ہیں بایں طور کہ اپنے رب کو خوف اور اُمید کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں، اور جو رزق ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی ان دو صفتوں کا ذکر صرف ایجابی انداز ہی میں نہیں کیا ہے بلکہ حکمی انداز میں بھی اس نے ان صفتوں کی طرف اہل ایمان کی توجہ جگہ جگہ مبذول کرائی ہے

مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝

(ابراہیم: ۳۱)

تم ہمارے ان بندوں سے کہہ دو جو ایمان لائے ہیں کہ وہ نماز قائم کریں، اور ہم نے جو رزق انھیں دے رکھا ہے اس میں سے کھلے اور پوشیدہ دونوں طرح خرچ کریں، اس دن کی آمد سے پہلے پہلے جب نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی یاری و مددگاری کام آئے گی۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝

(حج: ۷۸)

اے ایمان والو! تم رکوع اور سجدہ کیا کرو، اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلے کام کرو کہ تم کو کامیابی نصیب ہو۔ اور اللہ کے راستے میں انتھک جد و جہد کرو۔ اس نے تم کو (اس منصب جلیل کے لیے) چن لیا ہے۔ اس نے تم پر دین (کے احکام میں) کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ یہ تمہارے باپ ابراہیم ہی کا دین و طریقہ ہے۔ اس نے (نزول قرآن سے) پہلے بھی تمہارا نام مسلم ہی رکھا تھا، اور اس دین (محمدی) میں بھی تمہارا یہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم دوسرے لوگوں پر حق شہادت ادا کرو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو۔ وہی تمہارا کارساز ہے، اور کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

Marfat.com

قرآن پاک میں جہاں کہیں مومن کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آپ کو اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا ذکر ضرور ملے گا۔ تنہا یہی بات ان دو صفات کی اہمیت کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

اقامت صلوٰۃ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ مومن کا قلب خدا کی محبت یقین آخرت اور جذبہ شکر و امتنان سے معمور ہے۔ ایک مومن نماز پڑھ کر یہی نوٹ کرتا ہے کہ عظمت وکبریائی اور اطاعت و معبودیت کے لائق صرف ایک خدا کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جو ایک انسان کے نیاز و بندگی کا سزاوار ہو۔

ایک مومن کا دن میں پانچ بار ہر حالت اور ہر موسم میں اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے مالک حقیقی سے سچی محبت کرتا ہے اور اس کے بے شمار احسانات کا معترف ہے۔ یہ احساس تشکر ہی تو ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے محسن کے آگے سر تسلیم خم کر دے، اس کا شکر بجا لائے، اس کی حمد و ثنا کرے اور اس طرح رشتۂ بندگی کو مضبوط سے مضبوط تر کرے۔ فی الواقع یہی رشتۂ نیاز و عبودیت اس جہانِ ناپیدا کنار میں اسے حیران و سرگشتہ ہونے سے بچاتا ہے اور اس کو حقیقی منزل زندگی سے روشناس کراتا ہے۔ جہاں یہ رشتۂ بندگی ٹوٹا پھر کوئی اسے سرگشتگی اور بے راہ روی سے بچا نہیں سکتا۔ فواحش و منکر سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہی نماز ہے جو ایک مومن کے قلب و دماغ کو طہارت و پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ گویا یہ ایک چشمۂ صافی ہے جس میں پانچ بار نہانے کے بعد جسم و روح دونوں مصفا و مجلّا ہو جاتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے جس میں آپ نے صحابہؓ سے فرمایا:

"اچھا بتاؤ، اگر کسی کے دروازہ کے پاس ایک نہر جاری ہو اور وہ اس میں ہر روز پانچ بار نہائے تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہ نے عرض کیا: نہیں حضور اس کے جسم پر کوئی میل باقی نہیں رہے گا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا ایسی ہی مثال پانچ اوقات کی نمازوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ نماز پڑھنے والوں کی خطاؤں کو دور فرماتا ہے، اور انہیں پاک و

Marfat.com

صاف بناتا ہے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے لیکن اس کی زندگی فواحش سے آلودہ ہے تو وہ صحیح معنوں میں نماز پڑھ ہی نہیں رہا ہے یا وہ نماز کے مقصد و مفہوم سے بالکل نا آشنا ہے، کیا طہارت کے ساتھ گندگی کا اجتماع ممکن ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں نماز ایک مومن کی سب سے نمایاں اور امتیازی علامت تھی اور اس کے ترک کو کفر کے مماثل سمجھا جاتا تھا[2] لیکن اسے گردش روزگار کا کرشمہ کہئے کہ آج ترک نماز کے بعد بھی لوگوں کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور بہت سے تارکین صلوٰۃ ایسے بھی ملیں گے جن کو اصرار ہے کہ ان کو اہلِ ایمان کی صفِ اول میں جگہ دی جائے۔ کاش وہ سمجھتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ ایمان ان کے گھر کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ خواہ کچھ بھی کریں اس پر ان کا قبضہ بہرصورت قائم رہے۔ ترک نماز کے بعد ایمان کا دعویٰ بے جان ہو کر رہ جاتا ہے اور بے جان دعوے انعام و اکرام کے مستحق نہیں ہوتے۔

یہ تو تارکین صلوٰۃ کا طرزِ عمل تھا جو مسلمان پانچ اوقات کی نمازیں ادا کرتے ہیں ان کی اکثریت بھی اپنی عملی زندگی میں تارکین صلوٰۃ سے کچھ زیادہ مختلف دکھائی نہیں دیتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز نام ہے چند ظاہری اعمال و رسوم کی ادائیگی کا اور جس نے یہ کر لیا وہ مصلّین کے زمرہ میں شامل ہو گیا خواہ اس کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کسی عمل کو دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خدا کو فی الواقع اپنا مالک و حاکم اور خود کو اس کا غلام سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ نہایت ہی بے خوفی اور دیدہ دلیری کے ساتھ ان افعال شنیعہ کا ارتکاب بھی کر گزرتے ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول نے نہایت ہی سختی کے ساتھ روکا ہے اور جس کے مرتکب کو عذاب جہنم کا سزاوار قرار دیا ہے۔ مصلین کے اس طرزِ عمل کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ نماز کی حقیقت اور غرض و غایت سے بالکل بے خبر ہیں، اور دوسرا سبب ان کا یہ خیال خام ہے کہ چونکہ وہ مصلی ہیں اس لیے خدائے رحیم و کریم ان کی بداعمالیوں کو اپنے دامن عفو و رحمت میں ڈھانپ لے گا۔ رحمت کے اس غلط تصور

---

[1] متفق علیہ۔ [2] آنحضورؐ کا ارشاد ہے بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ۔ مسلم رواہ جابر بن عبداللہؓ

نے آج عوام کی اکثریت کو محاسبۂ آخرت سے بالکل بے خوف بنا دیا ہے۔

کاش وہ سمجھتے کہ جس نماز کو ایک مسلم کا طغرائے امتیاز قرار دیا گیا ہے وہ جہاں ایک طرف نمازی کو خدا کی اطاعت و بندگی سکھاتی ہے وہاں دوسری طرف خود نمازی کا تزکیۂ نفس بھی کرتی ہے، اسی لیے تو فرمایا گیا ہے: ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (عنکبوت: ۴۵)
(بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے)

نماز کی طرح ایتائے زکوٰۃ بھی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے۔ اگر وہ صاحب مال ہوتا ہے تو اپنے مال سے غربا و مساکین اور دوسرے حاجت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ درحقیقت ایک مومن کے جود و عطا کے پیچھے کوئی نفسانی غرض کارفرما نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف خدا کی محبت میں انفاق مال کرتا ہے، کیونکہ جو شخص خدا سے سچی محبت رکھتا ہے ناممکن ہے کہ وہ اس کے بندوں کی محبت سے بے نیاز ہو۔ قرآن پاک نے مومن کے اس وصف کو بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ (بقرہ: ۱۷۷)

وہ صرف خدا کی محبت میں قرابت داروں پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، مسافروں پر، سائلوں پر اور غلاموں کو قید غلامی سے چھڑانے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (دہر: ۹)

وہ صرف خدا کی محبت میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو تم کو صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی شکریہ کے خواستگار ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ

Marfat.com

نِعۡمَةٍ تُجۡزٰۤى ۝ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِ الۡاَعۡلٰى ۝ وَلَسَوۡفَ يَرۡضٰى ۝ (الیل: ۱۷-۲۱)

(جہنم سے) اس خدا ترس بندے کو ضرور بچا لیا جائے گا جو اپنا مال صرف اس لیے خرچ کرتا ہے کہ (حبّ مال کی نجاست سے) خود کو پاک کرلے۔ اس کے ذمّہ کسی کا کوئی احسان نہیں ہوتا کہ مال خرچ کرکے اس کا بدلہ اتارے وہ صرف اپنے بلند و برتر پروردگار کی رضا جوئی میں انفاق مال کرتا ہے۔ اور وہ عنقریب راضی ہو جائے گا۔

ایک حدیث قدسی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بندوں سے محبّت کا سلوک کرتا ہے وہ گویا خدا سے محبت کرتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی۔ وہ متعجب ہو کر کہے گا: میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا کہ تو سارے جہان کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی؟ اگر تو اس کی مزاج پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اسی طرح خدا فرمائے گا: اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا: کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی خدا فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ بندہ عرض کرے گا: بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے؟ تو تو خود پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہ پلایا، اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔"[1]

خشیّت قلب اور توکّل علی اللہ

خشیت قلب اور توکّل علی اللہ بھی مومن کی نمایاں صفات میں سے ہیں جیسا کہ قرآن مجید

[1] مسلم روایہ ابو ہریرہؓ

میں ایک جگہ آیا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۔

بیشک مومن تو وہی لوگ ہیں کہ جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر کانپ جاتے ہیں، اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے؛ اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اور جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ رزق انھیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔

اس آیت میں اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ مومن کی جن دو صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ خشیت قلب اور توکل علی اللہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مومن کا قلب اللہ کی سطوت وجلال اور عظمت وکبریائی کے تصور سے ہر آن لرزاں وترساں رہتا ہے۔ وہ خدا کا ذکر سن کر بے اثر نہیں رہتا بلکہ اس کے قلب ودماغ کا ہر تار مرتعش ہو جاتا ہے۔ یہ خشیت قلب ہی ہے جو مومن کے اندر توکل علی اللہ پیدا کرتی ہے۔ حالات کیسے ہی ہمت شکن، صبر آزما اور پریشان کن ہوں وہ خدا کی ذات پر کامل یقین واعتماد رکھتا ہے۔

توکل کا مفہوم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور ناکاروں اور کم ہمتوں کا طرز عمل نہیں ہے بھلا ایک مومن کا اس نام نہاد توکل سے کیا واسطہ؟ قرآن بطور صفت مومن کے جس توکل کی بات کرتا ہے وہ جہد وعمل سے مربوط ہے وہ کسی بھی مشکل وقت میں اور زندگی کے کسی بھی نازک موڑ پر جد وجہد اور سعی وتدبیر سے غافل نہیں ہوتا۔ البتہ جہد وعمل کے نتیجے کو خدائے بزرگ وبرتر کے سپرد کر دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جہان حادثات کا کوئی حادثہ اور اس عالم تغیرات کا کوئی واقعہ بھی اس کے حکم کے بغیر نہ وقوع میں آسکتا ہے اور نہ ہی دفع ہو سکتا ہے: نفع ونقصان اور کامیابی وناکامی سب کا سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

توکل کی یہ اسپرٹ مومن کے قلب ودماغ کو طمانیت بخشتی ہے اور اس کے عزم و

Marfat.com

ہمت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ کیا جو شخص اپنا معاملہ خالق ارض وسما ، مالک بحر و بر اور حاکم موجوداتِ کل کے سپرد کر دے وہ بھی کبھی خسران و خجالت سے دوچار ہو سکتا ہے؟ اوراقِ تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ جس فرد اور جس قوم نے خشیت اور توکل علی اللہ کے صحیح جذبے سے کام لیا وہ کبھی ناکام و نامراد نہیں رہی۔ مومن کے توکل کی ایک عمدہ تصویر یہ آیتِ قرآنی ہے:

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (آل عمران: ۱۵۹، ۱۶۰)

پس جب تم پختہ عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو جائے تو پھر تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہاری حمایت سے دست بردار ہو جائے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے گا۔ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کا توکل عزم و ارادہ اور سعی و جہد سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ ہر ممکن تدبیر کے بعد جب وہ کسی کام کا عزم کر لیتا ہے تو پھر خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے عمل کی راہ میں گام فرسا ہو جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ سے اجتناب، عفو و درگزر اور مشاورت

اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ اور توکل کے ساتھ ہی گناہ کبیرہ سے اجتناب، عفو و درگزر اور باہمی معاملات میں شورت بھی ایک مومن کی صفات حسنہ میں داخل ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

فَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَأَبْقٰى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبٰٓئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ۝ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ

Marfat.com

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝

(شوریٰ: ۳۶ تا ۳۸)

تم کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا (چند روزہ) مال ومتاع ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اور جو بڑے بڑے گناہوں اور فواحش سے اجتناب کرتے ہیں، اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں، اور جو اپنے رب کے ارشادات کی تعمیل کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ان کا ہر کام باہم مشورہ سے ہوتا ہے۔ اور جو رزق ہم نے اُن کو دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ایک مومن دیدہ ودانستہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا، کیا وہ ایمان کی روشنی کے بعد بھی فواحش کی تاریکیوں کا شکار ہوتا ہے؟ وہ حتّی الوسع یہی کوشش کرتا ہے کہ اس کا دامنِ ایمان، افعالِ بد سے میلا نہ ہو۔ برے افعال کا ارتکاب تو درکنار ایک مومن کے قلب ودماغ میں کسی برائی کا خیال بھی آجاتا ہے تو وہ متنبہ ہو جاتا ہے اور فوراً توبہ واستغفار کرتا ہے، گویا اس کا قلب ایک ایسا نازک آبگینہ ہوتا ہے جو گناہ کی پرچھائیں کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وہ گناہ کبیرہ کی شراب تند کی تاب لا سکے۔

ایک مومن عفو ودرگزر کا پیکر ہوتا ہے۔ عفو کے بالمقابل جوشِ غضب اور جذبۂ انتقام ہے۔ یہ نفس انسانی کا ایک حیوانی خاصّہ ہے۔ جس انسان کے قابو میں اس کا نفس نہیں ہوتا وہ زندگی کے تقریباً ہر معاملے میں اس جذبۂ نفسانی سے مغلوب ہو جاتا ہے بالخصوص اس وقت جب اس کی انا اور جذبۂ خودستائی مجروح ہوتا ہے۔ ادھر جذبۂ انا مجروح ہوا اور اُدھر اس کے دل میں شدید نفرت وعداوت اور جوشِ انتقام کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں وہ مکمّل طور پر حیوان صفت ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس ایک مومن کا نفس اس کے قابو میں ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اسے بے لگام اور مطلق العنان نہیں ہونے دیتا کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ اگر نفس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی گئی تو پھر قلب وروح کی دنیا فتنہ وفساد

سے محفوظ نہیں رہ سکتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومن کا نفس بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ ایک مومن کو بھی بتقاضائے بشریت کبھی غصہ آجاتا ہے لیکن وہ غصے میں بے قابو نہیں ہو جاتا جس طرح وہ غصہ ہوتا ہے اسی طرح فراخدلی کے ساتھ عفو و درگزر کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اس کے غصہ کا وقفہ طویل نہیں ہوتا، اِدھر غصہ آیا اور اُدھر عفو و درگزر کی بانہیں دراز ہو گئیں جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۴)

وہ غصہ کو پی جاتے ہیں، اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں، اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔

مومن نہ خودسر ہوتا ہے اور نہ خودرائے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے پر اس طرح نظر ڈالتا ہے جیسے یہ اس کا تنہا معاملہ نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنے تمام معاملات میں باہم دگر مشورت کو ضروری خیال کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کامل ہے اور وہ خطا سے محفوظ اور خواہشات نفسانی سے پاک ہے۔ اگر کوئی شخص تنہا اپنی عقل اور صوابدید کی بنیاد پر کسی معاملے میں کوئی اقدام کرتا ہے تو لغزش فکر و عمل سے مامون رہ جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر معاملہ انفرادی کے بجائے اجتماعی ہے تو پھر غلط اقدام کے نتائج بھی اتنے ہی دوررس اور ہلاکت آفریں ہوں گے۔ اسی لیے ایک مومن کسی معاملہ میں بھی خواہ وہ انفرادی نوعیت کا ہو اور خواہ اجتماعی، اپنے دوسرے رفیقوں سے ذکر و مشورت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل فی الواقع اس کے قلب کی طہارت، جذبۂ اشتراک و تعاون اور عجز و انکسار کی علامت ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ایک مومن خود بھی معروف پر عمل کرتا ہے اور منکر سے حتی الامکان بچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے انسانوں کو بھی نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے تاکہ

Marfat.com

خیر غالب ہو اور شر مغلوب ہو۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہے۔ وہ خود عاشق خیر ہوتا ہے اس لیے وہ دوسروں کی زندگی میں بھی خیر کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس بخیل دولت مند کی طرح نہیں ہوتا جو مال وزر کی کثرت کے باوجود کسی حاجت مند کی حاجت روائی نہیں کرتا' وہ اس حاسد امیر کی طرح بھی نہیں ہوتا جو خود تو تونگری چاہتا ہے لیکن دوسروں کو صاحب مال و زر ہوتا نہیں دیکھ سکتا، وہ اس فیاض امیر کی طرح ہوتا ہے جو اپنی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے تاکہ اس کے گردو پیش میں کوئی شخص محروم اور نامراد نہ رہ جائے۔

ایک مومن کسی حال میں بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کام سے غافل نہیں ہوتا کیوں کہ خیر سے محبت اور شر سے نفرت اس کی فطرت میں داخل ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ شر اور گناہ کو فروغ پاتا ہوا دیکھے اور خاموش رہ جائے، اگر خاموش رہ جائے تو وہ صحیح معنوں میں مومن نہیں ہے۔ قرآن پاک میں مومن کے اس وصف کو متعدد آیتوں میں نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورہ توبہ: ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ اللہ عنقریب ایسے لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝
(آل عمران: ۱۱۴)

Marfat.com

وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکوکاروں میں ہیں۔

ایک اور جگہ آیا ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (توبہ: ۱۱۲)

(مومنوں کی صفات یہ ہیں) توبہ گزار، عبادت گزار، خدا کی حمد و ثنا کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے والے، اچھی باتوں کا حکم دینے والے اور بری باتوں سے روکنے والے، اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے، اور ایسے مومنوں کو تم (اے نبی) بشارت دے دو (جنت اور رضائے الٰہی کی)

اس آخری آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہی مومن کی دوسری صفات کا بھی ذکر آیا ہے یعنی وہ توبہ کرنے والا، اطاعت گزار، خدا کی توصیف و تمجید کرنے والا، رکوع و سجدہ کرنے والا اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مومن صرف دوسروں کو ہی توبہ و انابت، اطاعت و فرماں برداری، حمد و عبادت الٰہی اور حدود شریعت کی پابندی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ خود بھی ان باتوں پر صدق دل کے ساتھ عمل کرتا ہے۔

ایک مومن کو جب اللہ زمین پر غلبہ و اقتدار عطا کرتا ہے تو اس وقت بھی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل نہیں ہوتا بلکہ زمین پر غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانے کا وہ مطلب ہی یہ سمجھتا ہے کہ مخلوق خدا کو اچھی باتوں کی تعلیم و تلقین کرے اور انھیں بری باتوں سے روکے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (حج: ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے، اور اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے، اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کو جب اللہ حکومت عطا کرتا ہے تو اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ تین باتیں اس کے فرائض منصبی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی مومن تخت حکومت پر متمکن ہونے کے بعد ان فرائض کی انجام دہی سے غفلت برتتا ہے تو اس کی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت نہیں کہا جا سکتا ہے خواہ اس کے حدود مملکت میں چند شرعی قوانین ہی کیوں نہ نافذ ہوں۔

صبر، صدق، قنوت، انفاق اور استغفار

صبر و ثبات، راست بازی، حق گوئی، فرماں برداری، انفاق، اور توبہ و استغفار ایک مومن کی زندگی کے وہ آبدار موتی ہیں جو اس کے آئینہ حیات کو صیقل کرتے ہیں اور اس کو رعنائی و زیبائی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں مومن کے ان اوصاف حسنہ کو درج ذیل الفاظ میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ۝ (آل عمران: ۱۶، ۱۷)

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں سے درگزر فرما اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچالے (یہ لوگ ان صفات کے حامل ہوتے ہیں) ہر حال میں ثابت قدم رہنے والے، راست باز، فرماں بردار، (راہ خدا میں) خرچ کرنے والے، اور ہنگام صبح توبہ و استغفار کرنے والے۔

ایک مومن کی زندگی صبر و ثبات کا پیکر ہوتی ہے۔ حوادث روزگار کیسے ہی صبر آزما ہوں، حالات کیسے ہی ناموافق اور ہمت شکن ہوں، اور اسباب مدافعت کتنے ہی کمزور

Marfat.com

اور ناکافی ہوں، وہ نہ تو ہمت ہار کر بیٹھتا ہے اور نہ اس پر کوئی خوف و غم طاری ہوتا ہے، اور نہ وہ کم ہمتی اور بزدلی ہی کا مظاہرہ کرتا ہے، غرض یہ کہ کہیں سے بھی اس کے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ہر ابتلا و آزمائش کے وقت ایک سنگی دیوار کی طرح ثابت و قائم رہتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حالت ایمانی کا نقشہ ایک جگہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۴۶)

اور کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا ترسوں نے (اللہ کی راہ میں) قتال کیا ہے۔ اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کی وجہ سے نہ تو انھوں نے ہمت ہاری اور نہ کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ کیا، اور نہ ہی وہ اپنے حریف سے دبے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سچا مومن وہ ہے جو شدتوں اور مصیبتوں میں نہ تو بے ہمت ہو، نہ کمزور پڑے اور نہ کسی حال میں بھی ظالموں کے آگے عجز و بے چارگی کا اظہار گوارا کرے۔ قرآن کہتا ہے وھن، ضعف اور استکانت للخصم اس میں نہیں ہو سکتی۔ وھن یہ ہے کہ بے ہمت ہو کر بیٹھ رہے۔ ضعف یہ ہے کہ میدان میں نکلے مگر کمزوری دکھائے۔ استکانت للخصم یہ ہے کہ لاچار ہو کر حریف کے آگے گڑگڑانے لگے۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ عجز و تذلل اور بے بسی و بے چارگی کا نام صبر نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن جس صبر کی تعلیم دیتا ہے اس میں علوئے ہمت، جراءت

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول ص ۳۷۲

Marfat.com

وجواں مردی، قوت برداشت اور ثبات واستقامت جیسی صفات داخل ہیں[1] ایک حدیث رسول سے صبر کے مفہوم پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لا تتمنّوا لقاء العدو واسئلو الله العافیة فاذا لقیتموهم فاصبروا واعلموا انّ الجنة تحت ظلال السیوف[2]

دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت چاہو مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور خوب سمجھ لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

جہاد زندگانی میں ایک مومن کی متاع گراں بہا یہی صبر ہے۔ یہی اس کا وہ ہتھیار ہے جس سے وہ مصائب ومشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ وہ مصائب وآلام کے ہر جرعۂ تلخ کو اس طرح گوارہ کر لیتا ہے جیسے یہ مصائب نہ ہوں شہد وشکر کے جام شیریں ہوں، وہ حزن وغم کی یورش میں بھی اس طرح مسرور اور شاداں رہتا ہے جیسے غم کی ہواؤں نے اس کے غنچۂ قلب کو چھوا تک نہیں، ناساعد سے ناساعد حالات میں بھی وہ اس طرح آسودہ قلب اور مطمئن خاطر رہتا ہے جیسے لیل ونہار کی کوئی گردش بھی اس کے خلاف نہ ہو۔

ایک مومن کی زندگی دراصل ایک صابر سپاہی کی زندگی ہوتی ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ میدان کارزار میں ایک کامیاب سپاہی کون ہوتا ہے؟ کیا وہ جس کے قدم بندوق کی ایک گولی اور توپ کے ایک گولے کی آواز سن کر پیچھے ہٹ جائیں؟ کیا وہ جو سروسامان جنگ کی قلت اور جنگ آزماؤں کی قلت تعداد کے باعث ہمت ہار کر راہ فرار ڈھونڈنے لگے؟ کیا وہ جو چند گھنٹوں کے لیے بھی بھوک اور پیاس کی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے؟ آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ ایسا سپاہی نا سزاوار جنگ ہے۔ سپاہی تو حقیقی معنوں میں وہی ہے جو بندوق کی گولیوں اور آگ اگلتی ہوئی توپوں کی گولہ باری میں بھی ثابت قدم رہے،

---

[1] ملاحظہ ہو آل عمران - ۲۰۰، بقرہ - ۲۵۰، انفال - ۶۵، بقرہ - ۲۴۹، محمد - ۳۱، بقرہ - ۱۵۵۔
[2] موطا (امام مالک)

Marfat.com

جو افراد اور سامان جنگ کی قلت سے ہراساں نہ ہو، اور جو بھوک اور پیاس کی اذیتوں کو برداشت کر سکے، دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامیاب سپاہی وہ ہے جو صابر ہو۔ میدان کارزار میں ایک مومن کا ترانۂ جاں نواز یہی ہے:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ۝ (بقرہ : ۲۵۰)

اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر، (میدان جنگ میں) ہمارے قدموں کو جما دے، اور کافروں پر ہم کو فتح عطا فرما۔

ایک مومن صادق و حق گو بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی حق گوئی سے انحراف نہیں کرتا خواہ اس حق گوئی کا نتیجہ اس کے حق میں کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ وہ جان و مال کا ہر نقصان گوارہ کر سکتا ہے لیکن سچائی کی راہ سے منہ موڑنا اس کے لیے ناممکن ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس جہان فانی کا ہر نفع و نقصان عارضی ہے۔ اس کی نظر ہمیشہ آخرت کی جاوداں زندگی پر ہوتی ہے۔ اسی زندگی اور اس کے نفع کا یقین اسے صداقت کی راہ پر قائم رکھتا ہے، اور اس راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت کو اس کے لیے آسان اور قابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔

اطاعت و تسلیم کی خو بھی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے۔ وہ اس وفادار اور اطاعت شعار غلام کی طرح ہوتا ہے جو اپنے آقا اور مالک کے اشارۂ چشم و ابرو کا منتظر رہتا ہے اور مالک کا حکم پاتے ہی اسے اس طرح ہنسی خوشی بجا لاتا ہے جیسے اس کی کوئی دلی مراد بر آئی ہو، اور جب وہ کسی کام سے اس کو روک دیتا ہے تو اس سے اس طرح رک جاتا ہے جیسے اس کے قدموں میں کسی نے زنجیر ڈال دی ہو۔ فی الواقع ایک مومن صادق کی زندگی سراپا اطاعت اور فرماں برداری ہوتی ہے۔ اس کے لغت حیات میں حکم عدولی نام کا کوئی لفظ مرقوم ہی نہیں ہوتا۔ اطاعت و فرماں برداری کے جذبہ سے وہ اس درجہ سرشار ہوتا ہے کہ ادھر خدا حکم دیتا ہے اسلم (جھک جاؤ) اور ادھر بندہ پکار اٹھتا ہے اسلمتُ لرب العٰلمین (میں دونوں جہان کے پروردگار

Marfat.com

کے آگے جھک گیا)

انفاق مال کی صفت بھی ایک مومن کے وجود کا ایک جوہر گراں مایہ ہے۔ حبّ مال اور جمع مال جو بدترین خصلت انسانی ہے، ان سے وہ بالکل پاک ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حبّ مال، تکاثر مال اور جمع مال کی دھن ہی ایک انسان کو خدا سے غافل بنا دیتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جمع مال مومن کا مقصد زندگی نہیں ہے اسی لیے وہ مال کماتا ضرور ہے لیکن خرچ کرنے میں کوتاہ دست نہیں ہوتا۔ وہ خوش حالی میں بھی خرچ کرتا ہے اور تنگی میں بھی، ينفقون فى السّراء والضراء (وہ تنگی اور خوش حالی دونوں میں خرچ کرتے ہیں)۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس کے دست انفاق کو ہمیشہ کھولے رکھتی ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(منافقون۔ ۱۰، ۱۱)

اور جو کچھ ہم نے تم کو رزق دے رکھا ہے اس کو خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت قریب آ لگے اور وہ کہنے لگے کہ "اے میرے رب تو نے مجھے مزید مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکار بنتا" جب کسی شخص کا وقت معیّن آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہیں کرتا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

توبہ واستغفار بھی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے بلکہ اس کے مومنانہ وجود کا مایۂ خمیر ہے۔ توبہ واستغفار سے غفلت دراصل تکبّر اور سرکشی کی علامت ہے، فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (منافقون: ۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے معافی کی دعا کرے تو سر جھٹکتے ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ تکبّر کے حال میں آنے سے رکتے ہیں۔

مومن اس امر سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے کہ انسان زہد و ورع کے اعتبار سے کتنا

Marfat.com

کامل ہو جائے لیکن پھر بھی وہ انسان ہی رہتا ہے، اور اس سے خطا و نسیان کا صدور عین ممکن ہے اسی لیے وہ کسی حال میں بھی توبہ و استغفار سے بے پروا نہیں ہوتا بلکہ کثرت سے توبہ و استغفار کرتا ہے۔ کثرت استغفار اس بات کا ثبوت ہے کہ مومن خدا سے قرب و محبت کے باوجود محاسبۂ آخرت سے بے خوف نہیں ہے بلکہ جتنا احساس قرب بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے توبہ و استغفار میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسے ہمہ وقت یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جس سے اس کا آقا و مالک ناراض ہو جائے اور عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر جائے۔ اور یہی حقیقی محبت کی علامت ہے۔

ایک مومن کے لیے توبہ و استغفار کا بہترین وقت ہنگام سحر ہے۔ اس وقت خدا اور بندے کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی۔ ذہن کے ارتکاز اور قلب کے استغراق کے لیے یہ بہترین وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں ایک بندۂ مومن خواب سحری اور نسیم صبح گاہی کے لطف و عیش سے بے نیاز ہو کر اپنے خلوت کدہ میں اس طرح محو راز و نیاز ہوتا ہے کہ ہاتھ طلب مغفرت میں بلند، آنکھیں اشک بار اور زبان خدائے قدوس کی تسبیح و تحمید میں زمزمہ سنج ہوتی ہے۔ یہی نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی ایک مومن متقی کا وظیفۂ حیات اور توشۂ آخرت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (الذاریات : ۱۵-۱۸)

بے شک خدا ترس لوگ باغات اور چشموں والی جگہوں پر مقیم ہوں گے۔ جو کچھ ان کا رب ان کو عطا کرے گا وہ خوشی خوشی اس کو قبول کریں گے۔ یہ لوگ دنیا میں نیکو کارانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ راتوں میں (عبادت کی وجہ سے) کم ہی سوتے تھے اور بوقت سحر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے تھے۔

Marfat.com

خشوعِ نماز، محافظت نماز، عفت نفس، امانت و دیانت، ایفاءِ عہد، قیام شہادت

خشوعِ نماز، محافظت نماز، پاک دامنی، امانت و دیانت، ایفاءِ عہد اور قیام شہادت کو بھی قرآن مجید نے ایک مومن کے اوصاف حسنہ میں شمار کیا ہے۔ ان صفات کو قرآن پاک نے دو جگہوں پر نمایاں انداز میں بیان کیا ہے، ایک جگہ فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝
وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝
وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ
اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ
عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ
الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (المومنون: ۱-۱۱)

وہ مومن کامیابی سے ہمکنار ہوئے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ اور جو فضول کاموں سے دور رہتے ہیں، اور جو زکوٰۃ نکالتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے (وہ کسی دوسری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے) ایسے لوگ ناقابل ملامت ہیں۔ جو اس کے علاوہ چاہے تو ایسے ہی لوگ بدراہ ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیماں کے محافظ و نگراں ہوتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی وہ اصلی وارث ہیں جن کو جنت وراثت میں ملے گی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ
مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝
وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤی

اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝

وہ لوگ جو ہمیشہ اقامت صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں، اور جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہوتا ہے، اور جو روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے خوف محسوس کرتے ہیں، بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے، اور جو اپنی شرم گاہوں کو (غلط کاری سے) محفوظ رکھتے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے (وہ کسی دوسری طرف نگاہ اٹھاکر بھی نہیں دیکھتے) ایسے لوگ ناقابل ملامت ہیں، جو اس کے علاوہ (کسی دوسری جگہ شہوت رانی کا) طلبگار ہو تو ایسے ہی لوگ (حدود اللہ سے) تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو امانتوں کے محافظ اور عہد و پیماں کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی ہر طرح محافظت کرتے ہیں۔
ایسے ہی لوگ جنت میں باعزت داخل ہوں گے۔

آپ دیکھیں کہ ان آیات کی ابتدا بھی نماز کے ذکر سے ہوئی ہے اور انتہا بھی نماز ہی پر ہوئی ہے۔ کیا یہ پیرایۂ بیان صراحت نہیں کر رہا ہے کہ ایک مومن کی زندگی میں نماز کا کیا مقام ہے؟ فی الواقع آپ جب بھی ایک مومن کا تصوّر کریں گے تو سب سے اوّل جو خیال آپ کے ذہن میں آئے گا اس میں نماز ضرور موجود ہوگی۔ نماز کے بغیر ایک مومنانہ زندگی کا تصوّر محال ہے۔ ایک مومن کی عملی زندگی کا دائرہ اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم بھی ہوتا ہے۔ غرض آپ جس پہلو سے دیکھیے گا یہی ملے گا کہ نماز مومن کا سرمایۂ حیات ہے۔

لیکن کون سی نماز؟ کیا وہ بے روح و بے اثر نمازیں جو ہم اور آپ پڑھتے ہیں کہ ہنگام نماز نہ جسم میں کوئی لرزش پیدا ہوتی ہے، نہ سازِ دل کا کوئی تار خوف خدا سے مرتعش ہوتا ہے اور نہ ہی آنکھوں سے دو چار قطرۂ اشک نکل کر رخساروں کو محبت الٰہی

کے سوز سے آشنا کرتے ہیں، نہیں، ایسی نمازیں نہیں بلکہ وہ نمازیں جن میں خشوع وخضوع کی رَو دوڑ رہی ہوتی ہے، جو قلب و روح کو ترساں اور جسم کو لرزاں بناتی ہیں، اور جو ہنگام نماز پلکوں پر اشک ندامت کے گرم گرم دیئے جلاتی ہیں۔

ایک مومن اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ہی دوام نماز اور محافظت نماز پر بھی سختی کے ساتھ کاربند ہوتا ہے۔ وہ ایک بار نماز شروع کر دینے کے بعد پھر اس کا سلسلہ کسی حال میں بھی منقطع نہیں کرتا یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانس تک وہ اس پر قائم رہتا ہے۔ وہ اوقات نماز کی پابندی اور اس کے تمام ظاہری آداب ولوازم کا بھی پورا پورا خیال رکھتا ہے۔

نماز کے ظاہری آداب ولوازم کی تکمیل کے ساتھ ہی اس کی نظر روح نماز یعنی خشوع و خضوع سے بھی غافل نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ اگر قلب میں خشوع وخضوع کی کیفیت نہیں ہے تو پھر ظاہری اعضائے بدن کا جھکاؤ بے معنی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جھکاؤ سے پناہ مانگی ہے۔ سچا مومن وہی ہے جس کے اعضا وجوارح اور قلب دونوں میں خشوع کی کیفیت پائی جائے۔

ایک مومن نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کے ساتھ ہی لغو اور لایعنی باتوں اور برے کاموں سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ اس کی خواہشات نفس کی طلب وسیری کا دائرہ صرف اپنے گھر تک محدود رہتا ہے۔ وہ کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی خلاف ایمان سمجھتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں طہارت نفس کا محافظ اور عصمت قلب ونظر کا امین ہوتا ہے۔

مومن، امانت دار، شاہد عدل اور عہد و پیمان کو پورا کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک امانت ودیانت، شہادت عدل اور پاس عہد سے بڑھ کر قیمتی کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔ جب وہ کسی سے عہد و پیمان کر لیتا ہے تو پھر نقض عہد کا مرتکب نہیں ہوتا خواہ اس کے نتیجے میں اس کو کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہوتا ہے:

الا لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لہٗ لمن لا عہد لہٗ [1]

---

[1] بیہقی فی شعب الایمان

Marfat.com

خبردار! جس میں امانت نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کا پابند نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

وہ صرف سچائی کی گواہی دینے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ سچی گواہی پر قائم بھی رہتا ہے۔ وہ کسی دباؤ اور مال و متاع کے لالچ میں سچی شہادت سے کبھی دست بردار نہیں ہوتا۔ مومن کی یہ تین صفتیں یعنی امانت داری، قیام شہادت اور ایفاء عہد، دراصل اس کی حب مال و زر سے بے نیازی، جرأت و بے باکی، بلندیٔ ظرف اور خوف خدا کی علامت ہیں۔ جو شخص مال و اسباب میں خیانت کر سکتا ہے اور جھوٹی گواہی دے سکتا ہے، اور انسانوں سے باندھے ہوئے عہد و میثاق کو توڑ سکتا ہے، وہ دین میں بھی دروغ گوئی اور خیانت کا مرتکب ہو سکتا ہے، اور خدا سے کیے ہوئے عہد و پیماں کو آسانی کے ساتھ توڑ سکتا ہے۔ امانت، شہادت حق اور ایفائے عہد کی صفات نہ صرف ایک فرد کی زندگی کو حسن و زیبائی اور جامعیت عطا کرتی ہیں، بلکہ ایک اچھے انسانی معاشرہ کے قیام و بقا کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ ان صفات سے خالی ہے تو اس میں لازماً دجل و فریب، استحصال اور خود غرضی و نفس پرستی کا دور دورہ ہوگا، اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ معاشرہ بہت جلد ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے گا۔

محبّت الٰہی

محبّت الٰہی ایک مومن کی نمایاں ترین صفت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (البقرہ: ۱۶۵)

اور جو ایمان لائے وہ اللہ سے بڑی گہری اور شدید محبت رکھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جب علماء توریت نے تورات کا پہلا حکم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

"اپنے خدا سے، اپنے سارے دل، اپنی ساری جان، اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ، بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔"[1]

---

[1] متی باب ۲۲: ۳۷، ۳۸

Marfat.com

امام بزازی نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء و شہدا بھی رشک کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔"

اس مضمون کی دوسری حدیثیں ترمذی، مشکوٰۃ اور بیہقی میں بھی مذکور ہیں۔ یہی بات قرآن حکیم میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۷ (مائدہ: ۵۴)

تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ ان کی جگہ ایسے لوگ لے آئے جن سے وہ محبت کرے اور وہ اس سے محبت کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں کثرت سے یہ دعا کرتے تھے:

اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الى حبك[۱]

میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت، اور اس کام کی محبت بھی جو تیری محبت سے قریب کر دے۔

ترمذی اور حاکم میں یہ دعا بھی موجود ہے۔

اللهم اجعل حبك احب الى من نفسى واهلى ومن الماء البارد[۲]

الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے، اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظروں میں محبوب بنا دے۔

---

[۱] [۲] ترمذی اور حاکم

Marfat.com

ان احادیث اور آیات قرآنی سے واضح ہو گیا کہ ایک مومن کی زندگی میں محبت الٰہی کا کیا مقام ہے؟ آپ اگر دنیا کی تمام محبتوں پر غور کریں تو آپ کو ہر محبت کے پس پردہ دو ہی محرکات ملیں گے، ایک راحت وسکون اور دوسرا احسان۔ اگر آپ راحت و احسان کے تصور کو الگ کر دیں تو محبت کا تصور خود بخود ختم ہو جائے گا گویا محبت و راحت اور احسان میں ناقابل شکست رشتہ ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیٹا اپنی ماں اور باپ سے محبت کرتا ہے، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ایام طفلی میں ماں اور باپ نے اس کے لیے ہر طرح کا ایثار کیا اور اس کے آرام و راحت کے لیے خود اپنے آرام و راحت کو فراموش کر دیا۔ اس احسان و ایثار کا لازمی تقاضا ہے کہ بیٹا ایام پیری میں والدین کے ساتھ احسان و ایثار کا سلوک کرے: ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ ایک بیوی اور شوہر کے درمیان محبت و یگانگت کا رشتہ بھی اسی اصول پر قائم ہے۔ بیوی شوہر سے اور شوہر بیوی سے صرف اس لیے محبت رکھتا ہے کہ ایک دوسرے کے لیے راحت وسکون کا ذریعہ ہے۔ یہی راحت وسکون جب مفقود ہو جاتا ہے تو زوجین علٰحدگی اختیار کر لیتے ہیں اور ان کی گزشتہ تمام محبتیں داستانِ پارینہ بن جاتی ہیں۔ ایک انسان مال واسباب، لباس وغذا، کھیت اور مویشی، باغ و دریا اور مناظر فطرت سے بھی والہانہ محبت و شیفتگی صرف اس لیے رکھتا ہے کہ یہ چیزیں اس کے جسم و روح کو راحت پہنچاتی ہیں۔ آگ کو دیکھئے کہ موسم سرما میں ہم اس کے دلدادہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے لیے راحت رساں ہوتی ہے، اور اسی آگ سے ہم موسم گرما میں دور بھاگتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ ہمارے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہی حال ایک مومن کی محبت الٰہی کا بھی ہے۔ اس کی محبت میں بھی احساسِ لطف و راحت اور پاس احسان کا جذبہ ہی کام کرتا ہے۔ جب وہ اپنے وجود کا اور اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع کائنات کا عمیق نظر سے جائزہ لیتا ہے تو اسے ہر شے راحت بخش ہر ذرہ زمین جود وسخا کا آئینہ اور ہر گوشۂ ہستی اسے فیضانِ محبت الٰہی کا سرچشمہ نظر آتا ہے۔ اس بے نہایت لطف و مہربانی اور اس بے طلب بخشش و کرم کا احساس و ادراک ہی

ایک مومن کے قلب و دماغ کو اپنے محسن کی محبت و عقیدت سے بھر دیتا ہے اور وہ اس سے دل و جان سے محبت کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ماں باپ، بیوی، بچے، بھائی بہن، گھر اور خاندان، مال و تجارت اور زمین و وطن غرض ہر چیز کی محبت اس کی محبت کے آگے گرد پا بن جاتی ہے، اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ اپنی جان عزیز بھی اس کے قدموں پر نثار کر دینا باعثِ سعادت و خوش بختی سمجھتا ہے۔

یہ کوئی افسانہ نہیں، ایک زندہ حقیقت ہے جو تاریخ کے اوراق میں نظر افروزی کے لیے موجود ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگیاں اس داستان محبتِ الٰہی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ انھوں نے خدا کی محبت میں اپنا گھر، مال و اسباب، بیوی بچے، بھائی بہن اور وطن کی محبت، سب کچھ قربان کر دیا حتی کہ اپنی جانوں کو بھی ہنسی خوشی اس کی راہ میں قربان کر دیا۔ خدا کی محبت اور دارِ آخرت کی طلب میں انھوں نے اس طرح جام شہادت نوش کیا جیسے یہ موت کا جام نہ ہو حیات سرمدی کا جام ہو۔ ابتلاؤ آزمائش کی وہ کون سی گھاٹی ہے جس سے وہ نہیں گزرے، اہانت، تعذیب اور سب و شتم کے ترکش کا وہ کون سا تیر ہے جو ان کے سینہ میں پیوست نہیں کیا گیا لیکن اللہ کی محبت میں انھوں نے ہر ظلم و اذیت کو ہنسی خوشی برداشت کیا، اور اس راہ میں لگنے والے ہر زخم کو صبر کے دامن میں چھپا لیا محبت ہو تو ایسی، عشق ہو تو ایسا، فداکاری و جاں نثاری ہو تو ایسی کہ انھوں نے اپنی جان کو جان آفریں کے سپرد کرنا تو گوارا کر لیا لیکن اللہ کی محبت سے دست برداری کے تصوّر کے بھی متحمل نہ ہو سکے۔

اس سلسلے میں حضرت خبیبؓ کی زندگی ہمارے لیے ایک روشن نمونہ ہے۔ جب کفارِ مکہ نے آپ کو شہید کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو آپ نے ان سے کہا کہ تم مجھے صرف دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دو۔ کفار نے اجازت دے دی۔ آپ نے دو رکعت نماز عجلت کے ساتھ پڑھی اور کفّار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم اگر مجھے یہ اندیشہ دامن گیر نہ ہوتا کہ تم طوالتِ نماز کو میری بزدلی پر محمول کرو گے تو میں کچھ دیر مزید اپنے رب کے حضور مصروفِ راز و نیاز رہتا، لیکن میں نے نماز اسی لیے جلدی ختم کر دی کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ میں

Marfat.com

موت کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا ہوں اور اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے سوز محبت الٰہی میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھے۔ ہم یہاں چند اشعار نقل کرتے ہیں جن سے حضرت خبیبؓ کی جرأت و جواں مردی، عزم و استقلال اور پرجوش محبت الٰہی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

وقد خیرانی الکفر والموت دونه وقد هملت عینای من غیر مجزع

انھوں نے مجھے کفر اور موت میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں لیکن یہ آنسو جزع و فزع کے آنسو نہیں ہیں (بلکہ محبت الٰہی کے آنسو ہیں)

ومالی حذار الموت انی لمیتٌ ولکن حذاری جحم نارٍ ملفع

میں موت سے ہرگز خائف نہیں ہوں۔ (ایک دن) بہرحال مجھے مرنا ہے، لیکن جہنم کے ان شعلوں سے ضرور خائف ہوں جو دور دور تک لپیٹ میں لینے والے ہیں۔

فواللّٰه ما ارجوا اذا مت مسلمًا الی ای جنب کان فی اللّٰه مصرعی

خدا کی قسم مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں جب مسلم ہو کر جان دوں تو راہ خدا میں میرا یہ گرنا کس پہلو پر ہوتا ہے۔

فلست بمبدٍ للعدو تخشعًا ولا جزعًا انی الی اللّٰه مرجعی[1]

میں دشمن کے سامنے کسی قسم کی ذلت کا اظہار اور خوف زدگی کرنے والا نہیں کیونکہ میں تو اللہ کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں۔

حسن اخلاق

اخلاق حسنہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس کے اندر خوش مزاجی و خوش روئی نرم گفتاری و خوش گفتاری، ایثار و ہمدردی، خلوص و محبت، عجز و انکسار اور عفو و درگزر سبھی اوصاف حمیدہ شامل ہیں۔ ایک حقیقی مومن کی زندگی ان تمام اوصاف و محاسن کی جامع ہوتی

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲، صفحہ ۱۲۳

Marfat.com

ہے۔ ہمارے ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف قرآن پاک میں ان لفظوں میں آئی ہے:۔

اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴) بیشک آپ بہترین اخلاق کے مالک ہیں۔

احادیث میں اخلاق حسنہ کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"تمام مومنوں میں ایمان کے لحاظ سے سب سے افضل مومن وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر ایک کے سامنے متواضع اور جھکنے والے ہیں۔ کوئی شخص ایمان کی حقیقت تک رسائی نہیں حاصل کرسکتا جب تک کہ وہ سب کے لیے وہی پسند نہ کرنے لگے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک اس کا پڑوسی اس کی ایذا سے مامون نہ ہو جائے"[1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھ کو تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں"[2]

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا:

"قیامت کے روز ایمان دار کی ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز خوش اخلاقی ہوگی اور بیشک اللہ تعالیٰ فحش بکنے والوں، بیہودہ گو اور حد ادب سے تجاوز کرنے والوں کو دشمن رکھتا ہے"[3]

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"دو خصلتیں کسی ایمان دار میں جمع نہیں ہوسکتیں، بخل اور بد خلقی"[4]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مقصد بعثت ہی حسن اخلاق کی تکمیل بتایا ہے چنانچہ فرمایا:۔ "میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"[5]

۱؎ ترمذی ۲؎ بخاری ۳؎ ترمذی

۴؎ ترمذی ۵؎ ترمذی

Marfat.com

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر مومنوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور ان باتوں سے اجتناب کے لیے کہا گیا ہے جو اخلاق حمیدہ کی ضد ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا … (بقرہ:۸۳) لوگوں سے عمدہ طریقہ سے بات کرو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاۤءٌ مِّنْ نِّسَاۤءٍ عَسٰى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (حجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے لوگوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کی عیب چینی کرو اور نہ ہی برے ناموں سے باہم کسی کو پکارو۔

ایک اور جگہ نصائح لقمان کے ذکر میں فرمایا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝ (لقمان:۱۸، ۱۹)

اور لوگوں سے تکبر کی وجہ سے منہ نہ موڑو، اور زمین پر اترا کر نہ چلو، اللہ کسی متکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ میانہ روی اختیار کرو، اور آواز کو پست رکھو۔ بیشک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔

ایک جگہ قرآن مجید میں مومنین کو عباد الرحمٰن کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور ان کی پہلی صفت جو بیان کی گئی وہ ان کا تواضع اور انکسار ہے، فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان:۶۳)

اور رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

Marfat.com

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کے اخلاق کی سب سے نمایاں خصوصیت، تواضع وانکسار ہے۔ جہاں آپ کبر ونخوت دیکھیں اور تکبر واستکبار کا اظہار پائیں یقین کرلیجئے کہ یہ شخص ایمان کی روشنی سے محروم ہے خواہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے عابد وزاہد ہی نظر آتا ہو۔ تواضع وانکسار وہ جوہر انسانی ہے جو ایک انسان کو حقیقی معنوں میں عظمت وبزرگی عطا کرتا ہے، اور یہ ہمیشہ سے تمام نیکوکاروں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک مابہ الامتیاز صفت رہی ہے، اور فخر وغرور ہمیشہ سے کم ظرف، بداطوار اور شیطانی خصائل کے حامل انسانوں کا شیوہ رہا ہے۔

مومن اور منافق میں فرق

تاریخ انسانی کا کوئی دور بھی منافقین کے وجود سے خالی نہیں رہا ہے۔ عہد رسالت میں بھی ان کی ایک جماعت موجود تھی۔ چونکہ یہ ظاہری اعمال واشکال میں مسلمانوں جیسے تھے اس لیے آسانی کے ساتھ مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے۔ یہ منافق اسلام کے پردہ میں اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں شب وروز مشغول رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے "مسجد ضرار" تک بنا ڈالی جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ (توبہ: ۱۰۷)

(کچھ اور لوگ ہیں) جنھوں نے ایک مسجد بنائی تاکہ (اسلام) کو نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور اہل ایمان میں تفرقہ ڈالیں، اور (اس مسجد کو) اس شخص کے لیے جاسوسی کا مرکز بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول سے برسر جنگ رہ چکا ہے۔

یہی صورت آج بھی قائم ہے۔ کتنے ہی ایسے مسلمان ملتے ہیں جو اپنے طرز فکر وعمل کے اعتبار سے عہد نبوی کے منافقین سے بھی دو چار قدم آگے نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جن کو عرف عام میں روشن خیال اور تجدد پسند کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین اور مسلم معاشرے کی اصلاح (REFORM) کے نام پر علانیہ فتنہ انگیزی

اور اسلام کے استیصال میں مشغول ہیں۔ ایسے ہی منافقوں کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ

جب بھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انھوں نے جواب میں یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں جو علانیہ اسلام کے خلاف تو کچھ نہیں کہتے بلکہ خود کو اسلام کا حقیقی علمبردار ظاہر کرتے ہیں لیکن فی الواقع وہی کام کرتے ہیں جو عہد رسالت کے منافقین کرتے تھے یعنی تفریق بین المسلمین۔ یہ دراصل "دیندار" قسم کے منافقین ہیں جو مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی اوٹ سے اسلام کی شکل وصورت کو مسخ کرنے اور مسلمانوں میں انتشار وافتراق کا بیج بونے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے قرآن مجید میں ہر قسم کے منافقین کے کچھ ایسے اعمال وخصائل بیان کر دیے ہیں جن کی مدد سے ہم آسانی کے ساتھ ہر دور میں ایک مومن ومنافق میں فرق وامتیاز کر سکتے ہیں۔ ہم منافقین کے ان اعمال وخصائل کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) شک اور تردّد

تاریخ میں جب بھی دعوت حق کا آوازہ بلند ہوا ہے تو اس کا واسطہ بالعموم تین طرح کے اشخاص سے پیش آیا ہے۔ اوّل وہ لوگ جو دعوت حق کو سنتے ہی اسے دل سے قبول کر لیتے ہیں، یہ مومن ہیں:

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا

(آل عمران: ۱۹۳)

اے ہمارے رب ہم نے ایک ایمان کی منادی کرنے والے کو یہ منادی کرتے ہوئے سنا کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لائے۔

Marfat.com

دوم وہ لوگ جو اس کا کھلے عام انکار کر دیتے ہیں اور ہر انذار کا جواب تمرّد و سرکشی سے دیتے ہیں، یہ کفار ہیں :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

(بقرہ : ۶)

جن لوگوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم ڈراؤ یا نا ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

سوم وہ لوگ جو نہ دعوت حق کو قبول کرتے ہیں اور نہ انکار بلکہ تذبذب کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک منافق کی سب سے اہم خصوصیت اس کے قلب کا ریب و تردّد ہے۔ منافق کا قلب شک کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ وہ زبان سے اللہ، اس کے رسول، اس کی کتابوں اور روز آخرت کے برحق ہونے کا اگرچہ اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوتا کہ یہ امور واقعتہً صحیح اور برحق ہیں :۔

مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هَٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۝ (نساء : ۱۴۳)

(منافق) نہ ادھر نہ اُدھر، درمیان میں حالت تذبذب میں، اور اللہ جس کو گمراہ کر دے اس کو تم راہ ہدایت نہیں دکھا سکتے۔

ایک منافق یقین اور شک کے درمیان معلق ہوتا ہے۔ اگر کبھی اس کے دل میں یقین کی کوئی ہلکی رمق پیدا بھی ہوتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ اس پر شک کے سائے دراز ہو جاتے ہیں، غرض یہ کہ اس کی پوری زندگی کشاکش ریب و یقین میں گزر جاتی ہے۔ منافق کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ قرآن مجید نے ایک تمثیل کے ذریعہ نہایت عمدہ طور پر کھینچا ہے :

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا (بقرہ : ۱۹-۲۰)

Marfat.com

یا منافقوں کی مثال اس بارش کی ہے جس میں تاریکی، بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک موجود ہو۔ وہ بجلیوں کی کڑک سن کر موت کے خوف سے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے ہیں، اور (وہ موت سے کہاں فرار حاصل کر سکتے ہیں کہ) اللہ انھیں گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلیاں ان کا نور بصارت اچک لیں۔ جب ذرا بجلی چمکی تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان کے ہر طرف تاریکی پھیل جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں (کہ اب کیا کریں)

اس تمثیل میں بارش سے مراد دعوت حق ہے جو نوع انسانی کے لیے مژدۂ رحمت وسعادت بن کر آئی، برق ورعد اور ظلمت سے مراد مشکلات ومصائب ہیں جو لازماً اعلان حق کے بعد اہل حق کو پیش آتے ہیں۔ لیکن جس طرح بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی چمک کے ہولناک مناظر کے پس پردہ رحمت حق انگڑائی لیتی ہے اور ان کا ظہور دراصل باران رحمت کے نزول کا اعلان ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح دعوت حق کے ظہور کے بعد اہل حق کو جو مصائب وموانع پیش آتے ہیں وہ فتح وکامرانی اور لطف وشادمانی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک وقت وہ آتا ہے جب حق کو غلبہ واستیلاء حاصل ہوتا ہے اور باطل کو شکست ونامرادی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

مثال کا آخری حصہ دراصل منافقین کے ذہنی رویے کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی جب حالات پر سکون ہوتے ہیں، کہیں سے بھی جان ومال کو کوئی گزند پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا تو منافق اپنے دعویٰ ایمان میں سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں، حق کی حمایت میں ان کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں، لیکن جب کوئی سخت ابتلاء وآزمائش پیش آجاتی ہے جس میں ان کو جان ومال کی ہلاکت اور بربادی کا خوف ہوتا ہے تو ان کے دعویٰ ایمان کا سارا زور غبارے کی ہوا کی طرح نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی اللہ اور اس کے رسول کے واضح احکام کی تعمیل میں خواہشات نفسانی اور سماجی عزت ووقار مجروح ہوتا نظر آتا ہے تو وہ عجیب مخمصے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ کس کو چھوڑیں اور کس کو اختیار کریں۔ اس کش مکش کا نتیجہ لازماً حق کے خلاف ہی نکلتا ہے، اور ہزار تاویلات کے پردے میں وہ باطل کی راہ میں گام زن ہو جاتے ہیں، بقول غالب:

Marfat.com

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اس سے معلوم ہوا کہ منافقوں کا یہ گروہ دراصل مفاد پرستوں کا گروہ ہوتا ہے۔ ان کے قلب و دماغ دعوت حق کی صداقت پر مطمئن نہیں ہوتے، لیکن یہ اپنے اندر علانیہ انکار حق کی جرأت بھی نہیں پاتے کیوں کہ ایسی صورت میں ان کے بے شمار مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ زبان سے تو خود کو مومن و مسلم کہتے ہیں لیکن ایمان اور اسلام کے تقاضوں سے ہمیشہ انحراف کرتے ہیں اور شب و روز وہ کام کرتے ہیں جو ایمان کی عین ضد اور مومنین کے قومی مفادات کو شدید نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں، لیکن ان حرکات کے باوجود ان کا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے کیونکہ وہ زبان سے خود کو مسلمان کہتے ہیں۔

(۲) اقامت صلوٰۃ میں ریا اور غفلت

یہ ایک حقیقت ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلافت دونوں میں ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا جو اعلان ایمان کے بعد تارک نماز رہا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آغاز اسلام میں ایمان اور اقامت صلوٰۃ ناقابل تفریق اجزاء کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں منافقین بھی نماز پڑھا کرتے تھے کیونکہ اس فرض کی ادائیگی کے بغیر ان کا دعویٰ ایمان غیر معتبر ہوتا۔ لیکن منافقین اور سچے اہل ایمان کی نمازوں میں نمایاں فرق تھا۔ مومنین کی نمازیں خشوع و خضوع، انہماک دماغ، حضور قلب، طلب خوشنودیٔ رب جیسے نماز کے عناصر ترکیبی سے مزین تھیں جب کہ منافقین کی نمازیں بے دلی اور ریاکاری کا مظہر تھیں۔ وہ دراصل نماز کو ایک بوجھ سمجھتے تھے اور مسجدوں میں بادل ناخواستہ صرف مسلمانوں کو دکھانے کے لیے کہ وہ بھی مومن ہیں، چلے جاتے تھے۔ منافقین کے اس طرز عمل کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ
قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(نساء: ۱۴۲)

Marfat.com

منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وہ ان کو مبتلائے خدع کر رہا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بادل ناخواستہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے، اور وہ اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

اس آیت قرآنی سے معلوم ہوا کہ دکھاوے کے لیے نماز پڑھنا یا بادل ناخواستہ پڑھنا ایک منافق کی علامت ہے۔ جو لوگ دعویٰ ایمان کے بعد بھی تارک نماز ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں اور اگر اسی حالت میں وہ اس دنیا سے رحلت کر گئے تو اپنے اس جرم کی کیا توجیہ کر سکیں گے؟ اس سلسلے میں اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے وہ بڑا قابل غور ہے۔ اہل جہنم کو جن نیک اعمال کے ترک کرنے پر حسرت اور افسوس ہوگا ان میں ترک نماز بھی ہے۔

يَتَسَآءَلُونَ ۙ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۙ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۙ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۙ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۙ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۙ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۞ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۞ (مدثر: ۴۰-۴۸)

وہ (جنتی) مجرموں کے بارے میں دریافت کریں گے "تم لوگوں کو جہنم کی سزا کیوں ملی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور فضول باتوں میں مشغول رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول رہا کرتے تھے، اور ہم روز آخرت کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ موت نے ہم کو آلیا۔" اس دن کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت ان کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہوگی۔

(۳) ایتاء زکوٰۃ سے غفلت اور بد دلی

نماز کے بعد عملی طور پر ایک مومن اور منافق کے درمیان جو چیز وجہ امتیاز ہے وہ انفاق مال ہے۔ اوّلاً تو منافق انفاق مال سے گریز کرتا ہے (ولیقبضون ایدیھم) اور اگر خرچ کرتا بھی ہے تو مجبوراً جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:

Marfat.com

وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ (توبہ: ۵۴)

وہ بادلِ ناخواستہ ہی خرچ کرتے ہیں۔

یہ تو دورِ رسالت کے منافقین تھے جو بادلِ ناخواستہ ہی سہی، زکوٰۃ ادا کرتے تھے، اور صرف اس لیے ادا کرتے تھے کہ اس کے بغیر وہ جماعت مومنین سے خارج سمجھے جاتے، لیکن آج جو لوگ دعوائے ایمان کے باوجود سرے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں کرتے انھیں سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنے دعوٰی میں کتنے مخلص ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے حضورؐ کے بعد مانعین زکوٰۃ کا جو فتنہ اُٹھا تھا، اس میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو خود کو مسلمان کہتے تھے، اللہ اور اس کے رسول، اس کی کتابوں اور روز آخرت پر ایمان رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور فریضۂ حج بھی ادا کرتے تھے۔ صرف ان کا اصرار یہ تھا کہ وہ زکوٰۃ حضور کے بعد کسی دوسرے کو ادا نہ کریں گے اور کچھ ایسے بھی تھے جو سرے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو عجیب مشکل سے دوچار کر دیا تھا۔ متعدد صحابہ جن میں حضرت عمر فاروقؓ بھی شامل تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں، اللہ، اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، بجز زکوٰۃ کے دوسرے تمام ارکان اسلام پر عمل کرتے ہیں، اس لیے صرف زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ ان صحابہ کی اس دلیل سے متفق نہ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی دعوئ ایمان کے بعد ضروری ہے جو لوگ اسے ادا نہ کریں گے ان کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔ آپ نے دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی:۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ: ۵)

پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان سے تعرض نہ کرو بیشک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت قرآنی کی روشنی میں فرمایا کہ ہم کو مشرکین کو صرف

Marfat.com

اس صورت میں چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے جب وہ شرک سے توبہ کر لیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ چونکہ وہ ان تین شرطوں میں سے ایک شرط پوری نہیں کر رہے ہیں اس لیے ان کے ساتھ جہاد درست ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس استدلال کو تمام صحابہ نے بالاتفاق تسلیم کر لیا اور پھر مانعین زکوٰۃ کے ساتھ جنگ ہوئی اور ان کو اسلام کے اس عظیم رکن کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

مانعین زکوٰۃ کا فتنہ دراصل اس وقت اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف منافقوں کی ایک منظم بغاوت تھی اور ایک باغی گروہ کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیئے وہ ہوا، لیکن ان مانعین زکوٰۃ کے خلاف صحابہ کے جہاد و قتال سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دین اسلام کا ایک نہایت اہم رکن ہے اور اس کے ترک کرنے والے کے خلاف اسلامی حکومت جہاد کرے گی۔

(۴) امر بالمعروف و نہی عن المنکر، بخل اور ذکر الٰہی سے غفلت

تقابل، قرآن مجید کا ایک معروف اسلوب بیان ہے چنانچہ وہ جہاں کسی چیز کے منفی پہلو کا ذکر کرتا ہے وہاں معاً بعد اس کے مثبت پہلو کو بھی اجاگر کر دیتا ہے تاکہ بات مکمل اور واضح ہو جائے۔ قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر دنیا کے ساتھ آخرت، جہنّم کے ساتھ جنّت اور کفر کے ساتھ ایمان کا ذکر اس کا واضح ثبوت ہے۔ قرآن حکیم نے بعض مقامات پر مومن اور منافق کے اوصاف و خصائل کا ذکر بھی تقابلی انداز میں کیا ہے تاکہ ایمان اور نفاق کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور کسی پہلو سے بھی کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ ایک جگہ منافق کے خصائل کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۚ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۚ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ

Marfat.com

اللّٰہُ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۝ (توبہ: ۶۷-۶۸)

منافق مرد اور منافق عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ بری باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور بخل کرتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا بیشک منافق ہی فاسق ہیں۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار کے لیے اللہ کا یہ وعدہ (فیصلہ) ہے کہ وہ انھیں جہنم کی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہی ان کا ٹھکانہ ہوگی۔ ان پر اللہ کی لعنتیں پڑیں گی اور ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا۔

اسی سورہ میں اور اسی سلسلۂ بیان میں چند آیتوں کے بعد ایک مومن کے اوصاف اور ان کا انجام ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ وَعَدَ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

(توبہ: ۷۱-۷۲)

مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے کے رفیق و دمساز ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ ان پر اللہ عنقریب اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ بیشک اللہ قدرت والا حکمت والا ہے۔ مومن مرد اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشگی کے باغات میں ان کے لیے خوشگوار رہائش گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑی چیز یہ کہ انھیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ دونوں آیتیں صاف بتا رہی ہیں کہ ایک مومن کی نمایاں صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے یعنی وہ اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک منافق کی نمایاں خصوصیت امر بالمنکر ونہی عن المعروف ہے یعنی وہ بری باتوں کی اشاعت کرتا ہے اور اچھی باتوں سے روکتا ہے۔ ہر دور میں یہ ایک منافق کی نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ وہ کسی کارِ خیر میں تعاون نہیں کرتا، لیکن فحش اور لایعنی باتوں میں وہ ہمہ وقت تعاون کے لیے تیار رہتا ہے اور اس انہماک اور جوش و سرگرمی سے ان کاموں میں اپنا مال اور وقت صرف کرتا ہے جیسے یہ کار شر نہ ہوں خیر و تقویٰ کے کام ہوں۔ وہ سماج میں نہ صرف نیکیوں کے فروغ کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ نیکی کا کام اگر کوئی کر رہا ہے تو اس کی راہ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنا اور اس پر نکتہ چینی کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ وہ خیر کے کاموں سے اس طرح دور بھاگتا ہے جیسا گدھا شیر کی آواز سن کر بھاگتا ہے، اور شر سے اس طرح لپٹ جاتا ہے جیسے مکھیاں غلاظتوں کے ڈھیر سے چمٹی رہتی ہیں اور چمٹی ہی نہیں رہتیں بلکہ غلاظت کو دوسرے مقامات تک منتقل کرنے میں بھی اہم حصہ لیتی ہیں۔

منافق کسی کارِ خیر میں ایک دمڑی دینے سے بھی جی چراتا ہے۔ وہ انتہائی درجے کا بخیل ہوتا ہے اور اس کی یہ بخالت دینی کاموں میں نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ اگر کبھی دیتا بھی ہے تو صرف نمود و نمائش کے کاموں میں۔

اللہ کے ذکر سے وہ بالکل غافل ہوتا ہے۔ اگر کسی محفل میں اتفاق سے ذکرِ خدا اس کے کانوں میں پڑ جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد موضوعِ گفتگو بدل جائے اور اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوتا ہے تو وہاں سے فوراً نکل بھاگتا ہے۔ جس آدمی کو ذکرِ خدا سے اس درجہ تنفر اور توحش ہو وہ اپنا سر خدا کے سامنے کیسے جھکا سکتا ہے؟

(۵) جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی

ایک منافق معاملاتِ زندگی میں نہایت بدمعاملہ اور بدکردار ہوتا ہے۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فحش گوئی اس کے شب و روز کا معمول ہوتا ہے۔ وہ فی الواقع اخلاق کی

Marfat.com

انتہائی پستی کی حالت میں ہوتا ہے۔ متعدد احادیث میں منافق کی اس پستیٔ ذہن اور دنائت طبع کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو بے وفائی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔"[۱]

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"چار خصلتیں جس میں پائی جائیں وہ منافق ہے، اوّلاً جب بات کرے تو جھوٹ بولے ثانیاً جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، ثالثاً جب عہد کرے تو بے وفائی کرے، رابعاً جب جھگڑا کرے تو گالی بکے۔"[۲]

اقسام منافقین

سطور بالا میں ہم نے منافقوں کے جن اعمال و خصائل کا ذکر کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک منافق تو وہ ہے جو زبان سے خود کو مسلم کہتا ہو لیکن دل میں اسلام کا شدید مخالف اور کفر کا حمایتی ہو (توبہ: ۸) دوسرا منافق وہ ہے جو زبان سے مسلم ہونے کا اعتراف کرتا ہو، اور اس کے دل میں بھی اسلام کے خلاف کوئی جذبہ نہ ہو لیکن عملاً خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہو مثلاً ارکان اسلام (نماز، روزہ وغیرہ) میں سے کسی رکن پر بھی عمل نہ کرتا ہو۔ قرآن مجید نے اس قسم کے منافق کو فاسق قرار دیا ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (توبہ) اور تیسرا منافق وہ ہے جو زبان اور دل سے اسلام کا اقرار کرتا ہو اور ارکان اسلام پر عمل پیرا بھی ہو، لیکن اس کے دوسرے اعمال اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوں مثلاً جیساکہ ہم بیان کر چکے ہیں، جھوٹ بولتا ہو، وعدہ خلافی کرتا ہو، غیبت کرتا ہو، گالم گلوچ بکتا ہو وغیرہ۔

---

[۱] ترمذی ابواب الایمان [۲] ترمذی ابواب الایمان

Marfat.com

عمل

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ
وَحُسْنُ مَاٰب ○ (رعد)

جو لوگ ایمان لائے اور عمدہ عمل کیے ان کے لیے خوش حالیاں
ہیں اور (بالآخر) بہت اچھا ٹھکانہ۔

Marfat.com

عمل

عمل کا مفہوم

انسان مختلف النوع داعیات، احساسات اور ارادوں کا مجموعہ ہے اور انہی خواہشات احساسات اور ارادوں کے فعلی ظہور کا نام عمل ہے۔ پہلے ایک خیال یا کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے جو قلب کو تحریک دے کر ارادہ کی صورت اختیار کرتی ہے اور یہی ارادہ جب بالفعل ظاہر ہو جاتا ہے تو اس پر عمل کا اطلاق ہوتا ہے، مثال کے طور پر غذا کے استعمال سے پہلے ہمارے اندر غذا کے استعمال کی خواہش پیدا ہوتی ہے جسے ہم بھوک سے تعبیر کرتے ہیں، اور پھر اس خواہش سے غذا کے حصول کا ارادہ جنم لیتا ہے اور یہ ارادہ ہم کو ایک مخصوص عمل کے لیے اکساتا ہے اور اس طرح ہم کھانا کھاتے ہیں۔ یہ ہمارے کھانے کا عمل ہوا اسی طرح ہمارے اندر کسی آدمی کو قتل کر دینے کی خواہش یا جذبہ پیدا ہو اور یہ جذبہ ارادہ کی صورت اختیار کرے اور ہم اس کو قتل کر ڈالیں تو یہ بھی ہمارا ایک عمل ہوا اگرچہ برا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی خواہش یا خیال ہی ہمارے کسی عمل کا محرک بنتا ہے۔ جیسے ہمارے خیالات اور جذبات ہوں گے ویسے ہی ہمارے اعمال ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہر عمل خواہ وہ اچھا ہو یا برا ہمارے قلب کی کسی نہ کسی حالت یا کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ ہمارے تمام احساسات اور ارادوں کا اصل سرچشمہ ہمارا قلب ہی ہے گویا عمل قلب کا آئینہ ہے جس میں درون قلب کے تمام احوال و کوائف کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اقسام عمل

قرآن مجید نے انسان کے تمام اعمال کو دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے، ایک

Marfat.com

عمل صالح اور دوسرا عمل غیر صالح، عمل صالح کے متعلق ایک جگہ فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ، اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر: ۱۰)

جو شخص عزت کا طلب گار ہے (وہ اچھی طرح جان لے کر) عزتیں سب اللہ کے لیے ہیں۔ اچھا کلام ہی اس تک پہنچتا ہے اور عمل صالح اسے پہنچاتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ (نمل: ۱۹)

اے میرے رب تو مجھے اس کی توفیق بخش کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جن سے تو نے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے اور اس بات کی بھی توفیق دے کہ میں وہ نیک کام کروں جس سے تیری رضا حاصل ہو۔

عمل غیر صالح کے متعلق ایک جگہ فرمایا ہے:

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ، اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)

اس نے کہا "اے نوح تیرے بیٹے کا تجھ سے کوئی رشتہ ناتا نہیں وہ تو (سراپا) ایک برا عمل ہے۔

عمل صالح کا مفہوم

عمل صالح کا ایک مفہوم تو بالکل واضح ہے یعنی وہ تمام اعمال حسنہ جن کی ہر دور میں مدح وستائش کی گئی ہے، عمل صالح میں داخل ہیں مثلاً خدا کی مخلصانہ عبادت، والدین کی خدمت، یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور مسکینوں کی اعانت، فاقہ کشوں، مسافروں اور بے سہاروں کی دست گیری، ایفائے وعدہ، ادائے امانت و حقوق، پابندئ عہد وغیرہ۔

عمل صالح کے اس ظاہری مفہوم کے علاوہ بھی اس کا ایک مفہوم ہے جو درحقیقت

تمام اعمال حسنہ کی اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس مفہوم تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے اس لیے اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ لفظ صالح، صلاح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ فساد کی ضد ہے[۱] مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا:

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اعراف: ۵۶)

زمین میں اصلاح کے بعد فتنہ و فساد برپا نہ کرو۔

دوسری جگہ فرمایا:

اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝

(اعراف: ۱۴۲)

تم میرے بعد میری قوم میں میرے جانشین بن کر رہنا اور ہر کام عدل و راستی کے ساتھ کرنا، اور مفسدوں کی راہ نہ چلنا

ایک اور جگہ فرمایا:

الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ۝ (الشعراء: ۱۵۲)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زمین میں اصلاح کے بجائے فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں۔

ان آیات قرآنی سے واضح ہوگیا کہ فساد صلاح کی بالکل ضد ہے۔ فساد کے معنی عدل و قسط کی راہ سے ہٹ جانے کے ہیں، اور صلاح کے معنی اس کے بالکل برعکس یعنی عدل و قسط پر قائم رہنے کے ہیں۔ لفظ اصلاح قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، یہ صلاح ہی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ٹھیک کرنے، سنوارنے اور عدل و قسط پر قائم کرنے کے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا:

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (انبیاء: ۹۰)

ہم نے اس کی دعا قبول کرلی اور اسے ایک فرزند (یحییٰ) عطا کیا اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کو (جو بانجھ تھی) اولاد کے قابل بنادیا۔

اصلاح زوج سے مراد یہ ہے کہ اعضاء تولید و تناسل میں جو خرابی تھی اس کو دور کر کے

---

[۱] دیکھئے مفردات (امام راغب)

Marfat.com

اس کے اندر فطری توافق وسازگاری پیدا کر دی جو عدل وتوازن کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔
دوسری جگہ فرمایا:

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ (حجرات:۹)

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔

دو متحارب گروہوں میں صلح کرانے کا مطلب یہی ہے کہ انھیں عدل وقسط پر قائم کیا جائے اور ایک کو دوسرے پر ظلم وزیادتی سے روکا جائے۔ آگے اسی سلسلۂ آیت میں عدل وقسط کے الفاظ بڑھا کر اصلاح کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے:

فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ (حجرات:۹)

پس اگر وہ (یعنی زیادتی کرنے والا گروہ) باز آجائے تو ان دونوں کے معاملات کو عدل کے ساتھ درست کردو اور (دیکھو) اس صلح وصفائی میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

ایک جگہ یوں آیا ہے:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ (بقرہ: ۱۸۲)

جو شخص کسی وصیت کنندہ سے کسی زیادتی یا گناہ کا اندیشہ محسوس کرے تو اگر وہ باہم اپنے معاملے کو درست کرلیں تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔

اس آیت میں معاملے کو درست کرنے کا مفہوم یہی ہے کہ عدل وراستی کے ساتھ وراثت کی تقسیم عمل میں آئے یعنی کسی کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی نہ ہو۔ عدل وقسط کی راہ سے انحراف کرنے والوں کو قرآن مجید مفسد قرار دیتا ہے۔

الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ۝ (الشعراء:۱۵۲)

وہ لوگ جو زمین میں تعمیر واصلاح کے بجائے فتنہ وفساد برپا کرتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے:

اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝

(اعراف: ۱۴۲)

Marfat.com

تو میری قوم میں میری نیابت کر اور عدل و قسط کی راہ پر قائم رہ اور مفسدوں کی راہ کبھی اختیار نہ کرنا۔

قرآن مجید میں توبہ و انابت کے بعد بالعموم اصلاح کا لفظ ضرور آتا ہے۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہوتا ہے کہ توبہ گزار ظلم و تعدی سے باز آ جائے اور عدل و قسط پر قائم رہ کر اپنے اعمال کو درست کرے مثلاً فرمایا:۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ

(مائدہ: ۳۹)

پس جس نے ظلم (گناہ) کے بعد توبہ کیا اور اپنے اعمال کو درست کر لیا، اللہ اس کی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۚ (نساء: ۱۶)

اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اپنے افعال درست کر لیں تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

قرآن حکیم نے اصلاح کا لفظ ایک دوسرے معنی میں بھی استعمال کیا ہے یعنی عمل کا بارآور ہونا اور دراصل یہ بھی عدل و قسط ہی کے نتیجے میں ظہور میں آتا ہے۔ اگر اشیاء میں عدل و توازن نہ پایا جائے تو اس سے افعال کا صدور ناممکن ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر عمل صالح، فاعل اور سماج دونوں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے، اور اس کے برعکس عمل غیر صالح، فاعل اور سماج دونوں کے لیے مضرت رساں ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مفسدین کو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہونے دیتا کہ وہ کائنات خلقت میں اس کے قائم کیے ہوئے نظام عدل و توازن کو بگاڑ دیں، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (یونس: ۸۱)

بیشک اللہ فتنہ پردازوں کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتا (کہ وہ زمین میں ظلم و فساد برپا کریں)

مذکورہ تمام قرآنی استعمالات سے واضح ہو گیا کہ لفظ اصلاح کے حقیقی معنی عدل و قسط

پر قائم کرنے کے ہیں، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ صلاحؔ ہی سے مشتق ہے، اور صلاح فساد کی ضد ہے اس لیے صلاح کے معنی عدل و قسط کے ہوئے۔ اس تعیّن معنی کے بعد عمل صالح کا مفہوم خود بخود واضح اور متعین ہو جاتا ہے یعنی ہر وہ اچھا عمل جو عدل و قسط یا دوسرے لفظوں میں اعتدال و توسّط کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے عمل صالح میں داخل ہے، اور ہر وہ عمل جو اعتدال و توسّط کے حدود سے متجاوز ہو، عمل صالح سے خارج ہے۔

قرآن مجید نے برے اعمال کے لیے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں ان کے معنی کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اعتدال و توسّط کی عین ضد واقع ہیں مثلاً ایک لفظ ظلم ہے جو قرآن مجید میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں وضع الشئی فی غیر موضعہ یعنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اس دوسری جگہ رکھ دینا جو اس کا محل نہ ہو۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے، کیونکہ اس سے زیادہ بے محل اور کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی کہ خالق کی جگہ مخلوق کو قبلۂ حاجات اور سجدہ گاہِ شوق بنا لیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شئے کا اپنے محل میں نہ ہونا ایک ایسی صورت ہے جو صریحًا عدل و قسط کے منافی ہے۔ اسی طرح اسراف و تبذیر دو لفظ ہیں جسے ہم افراط و تفریط بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسراف کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز جتنی مقدار میں خرچ ہونی چاہیئے وہ اس مقدار سے کہیں زیادہ خرچ ہو جائے، اور تبذیر یہ ہے کہ رقم اس جگہ خرچ کی جائے جو اس کے خرچ کا حقیقی محل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں عدل و قسط کے منافی ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ طغیان ہے، اس کے معنی کسی چیز کے حد سے گزر جانے کے ہیں، اور تجاوز عن الحدود، اعتدال و توسّط کی عین ضد ہے۔

اسی طرح ایک لفظ بخل ہے، یہ اسراف کی ضد ہے یعنی جو خرچ کا محل ہو اس میں بھی خرچ نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل بھی غیر مستحسن ہے۔ جب بخل اور اسراف دونوں غیر مستحسن ٹھہرے تو پھر عمل مستحسن وہی ہوگا جو ان دونوں کے درمیان واقع ہوگا، اور اسی درمیانی عمل کو سخاوت کہتے ہیں۔ اس بات کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ

Marfat.com

مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۝ (بنی اسرائیل : ۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو، اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

اس آیت میں گردن سے ہاتھ باندھنے سے مراد بخل، اور ہاتھ کھلا چھوڑ دینے سے مراد فضول خرچی ہے۔ اور یہ دونوں خرچ کی دو ایسی انتہائی حالتیں ہیں جو صریحاً نقطۂ عدل سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ جُبن ہے جس کے معنی بزدلی کے ہیں، اور اس کے برعکس ایک دوسرا لفظ تہوّر ہے جو سفاکی کی حدوں کو پہنچ چکا ہو۔ یہ دونوں ہی دو انتہائی حدودِ عمل ہیں، اور اسی لیے ان کا شمار اعمال غیر مستحسن میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کی درمیانی حالت کا نام شجاعت ہے، اور یہ ایک عمل مستحسن ہے۔

سطور بالا میں ہم نے تجاوز عن الوسط (Deviation From Mid Point) کی جو لفظی مثالیں دی ہیں اور بخل و اسراف سے متعلق جو قرآنی آیت نقل کی ہے اس سے بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک اسی عمل پر عمل صالح کا اطلاق ہوتا ہے جو دو انتہائی حدوں یعنی غلو اور تفریط کے بجائے اعتدال و توسط کے دائرہ میں رہ کر کیا جائے، اور جو عمل بھی اس دائرۂ اعتدال سے باہر ہے اس پر عمل صالح کا اطلاق نہیں ہوتا خواہ وہ عمل فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا ہو۔

ایک اور مثال لیجئے۔ عیسائیوں نے صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے رہبانیت یعنی ترک دنیا اور نفس کشی کی راہ اختیار کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کی تحسین نہیں کی کیونکہ یہ عمل اعتدال و توسط کی راہ سے ہٹا ہوا تھا، اور انسانوں کے حق میں مہلک نتائج رکھتا تھا، اور جو بعد کے ادوار میں کھل کر سامنے آ گیا۔ رُہبانیت کے مہلک نتائج سے قرون وسطیٰ کی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

بہترین عمل صالح

ہر اچھا عمل جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اگر اعتدال و توسط کے حدود میں رہ کر کیا جائے

عمل صالح کہلانے کا مستحق ہے، لیکن بہترین عمل صالح وہ ہے جو خدا کی راہ میں صرف اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (توبہ: ۱۲۰)

اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ وہ اللہ کی راہ میں پیاس تکان اور بھوک کی تکلیفیں اٹھائیں، اور جس راہ پر چلنا کفار کے لیے موجب غیظ و غضب ہو، اس راہ پر وہ گام زن ہوں، اور کسی دشمن سے اللہ کے لیے انتقام لیں اور اس کے بدلے میں ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (الیل: ۱۷-۲۱)

جہنم کی آگ سے وہ شخص دور رکھا جائے گا جو خدا ترس ہے، اور جو اپنا مال صرف اس لیے (راہ خدا میں) خرچ کرتا ہے تاکہ وہ (حب مال اور جمع مال کی گندگی سے) پاک و صاف ہو جائے۔ اس کے انفاق کے پیچھے کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کا جذبہ موجود نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف خدا کی رضا کی طلب میں ایسا کرتا ہے۔ اور وہ عنقریب (اپنے انفاق کے خوش گوار نتائج کو دیکھ کر) خوش ہو جائے گا۔

روز آخرت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل صالح کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی جو صرف نمود و نمائش کے لیے کیا جائے۔ آج بہت سے صاحب مال و دولت مسلمان آپ کو ایسے ملیں گے جو علانیہ فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں، اور اسلام کے کسی ایک رکن پر بھی عمل نہیں کرتے، لیکن غربا و مساکین کی مدد، مسجدوں، اسپتالوں مسافر خانوں کی تعمیر، مسجدوں میں چراغ و پانی کا انتظام اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے اچھے کام کرتے ہیں، اور یہ

گمان رکھتے ہیں کہ روزِ آخرت یہ اعمال ان کی بداعمالیوں اور خدا کے احکام سے دیدہ و دانستہ روگردانی کا کفّارہ بن جائیں گے۔ ایسے لوگ سخت فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ خدا کے حکموں سے بغاوت کر کے ان کا کوئی اچھا عمل بھی روزِ آخرت ان کے لیے سودمند نہ ہوگا۔ درحقیقت وہ جو بھی اچھے کام کرتے ہیں ان کے پیچھے خدا کی رضا طلبی کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کام وہ صرف نمود و نمائش اور جاہ و شہرت کی طلب میں کرتے ہیں۔ اگر واقعتہً ان کاموں سے خدا کی رضا مطلوب ہوتی تو پھر وہ ارکانِ اسلام اور خدا کے دیگر حکموں کی ہرگز خلاف ورزی نہ کرتے۔ خدا کے احکام سے روگردانی کر کے وہ خود ثابت کرتے ہیں کہ ان کا ایمان و اسلام صرف زبانی ہے۔ ایسے ہی ریاکاروں کے متعلق قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ (بقرہ: ۲۶۴)

وہ شخص جو لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور آخرت اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر مٹی پڑی ہو پس اس پر ایک زور کی بارش ہو جائے اور (اس کی ساری مٹی بہا کر) اسے بالکل صاف اور چکنا بنا دے۔ اسی طرح ان کی ساری کمائی اکارت جائے گی اور کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ لگے گا۔

عمل صالح اور عہدِ حاضر کے مسلمان

قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو "اُمّتِ وسط" کہا گیا ہے، ارشاد ہے:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

(بقرہ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

اس آیت میں "امت وسط" کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ امت ہے جو عدل و قسط کے اصولوں پر یقین رکھتی ہے، اور اس کا کوئی عمل بھی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعتدال و توسط کی ڈگر سے ہٹا ہوا نہیں ہے گویا امت وسط کی نمایاں اور مابہ الامتیاز خصوصیت اس کے اعمال کا اعتدال و توازن ہے[1] اس خطاب سے مسلمانوں کو اس لیے نوازا گیا تھا کہ وہ ہر دور میں تمام اقوام عالم کے لیے جو اپنے نظریہ و عمل میں ہمیشہ بے اعتدالیوں کا شکار رہے ہیں، ایک مبنی بر اعتدال، نمونۂ عمل بنیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے راہ وسط پر چلنے کے فیوض و برکات کا مشاہدہ کر سکیں، اور خود اس راہ پر چل کر دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل کریں۔ "لتکونوا شھداء علی الناس" سے اسی بات کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

لیکن آج کا مسلمان اپنے اس فرض منصبی سے عملاً غافل ہو چکا ہے۔ آج اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو بے اعتدالیوں کا شکار نہ ہو حتیٰ کہ اس کی مذہبی زندگی بھی جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ میں اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آج عمل صالح کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ جس مذہبی عمل میں جتنا ہی غلو اور تشدد اختیار کیا جاتا ہے وہ اتنا ہی عمدہ عمل قرار پاتا ہے۔ آج وہی مرد، مرد صالح ہے جو اوراد و وظائف، دعا اور نوافل کی کثرت میں سب پر سبقت لے جائے۔ کہنے کو تو یہی کہا جاتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے لیکن مسلمانوں کا ایک طبقہ اسی پر عمل پیرا ہے اور اسی کو عین اسلام قرار دیتا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ غلو اور تشدد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبان کی صفت قرار دیا ہے۔ حضرت انس رض سے روایت ہے کہ آنحضور ص فرمایا کرتے تھے:

لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوماً لیشددوا فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیار[2]

اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ بھی تم پر سختی کرے۔ ایک قوم نے تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی اسے سختی کے ساتھ پکڑا۔ وہ ان کے بقایا ہی تو ہیں جو تم کو راہب خانوں اور کنیسوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

---

[1] دیکھیے تفسیر غریب القرآن (ابن قتیبہ) ص ۶۵، تفسیر القرطبی ج ۲ ص ۱۲۰ [2] ابوداؤد

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعتدال و توسّط کی راہ چھوڑ دینے کا نام تشدّد ہے، اور یہ اُمّت وسط کی صفت نہیں ہے۔ اگر مسلمان خود کو اُمّت وسط سمجھتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں خواہ وہ مذہبی معاملہ ہو، خواہ معاشی اور خواہ معاشرتی، اعتدال و توسط کی روش اختیار کریں اور یہی عمل صالح کی راہ ہے۔

کیا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں

اس باب میں علماء کرام کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ ان علماء کا ہے جو اعمال کو ایمان کا جزو لازم سمجھتے ہیں۔ اس گروہ میں اکثر اکابر علماء سلف و خلف شامل ہیں۔ امام بخاری جیسے جلیل القدر محدّث بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جو اعمال کو ایمان کا جزو لازم تسلیم نہیں کرتے، امام ابوحنیفہؒ اور امام غزالیؒ جیسے جیّد علماء کا تعلق اسی دوسرے گروہ سے ہے۔ امام غزالی اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک معصیت کی جہت سے اصل ایمان اور سب طاعتوں کا ثواب تلف نہیں فرمائے گا۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ "ومن یقتل مومناً متعمداً" اس سے مراد یہ ہے کہ مقتول کو جان بوجھ کر ایمان ہی کی جہت سے مار ڈالے، اور اس آیت کے نزول کا سبب بھی ایسا ہی تھا۔ اب اگر کہو کہ تمہاری تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ مذہب مختار یہ ہے کہ ایمان بغیر عمل کے ہوتا ہے حالاں کہ اکابر سلف کا قول یوں مشہور ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبان کے اقرار اور اعضاء کے عمل کا نام ہے، تو اس قول سے کیا غرض ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عمل کو ایمان میں شمار کرنا کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا تمام کرنے والا اور پورا کرنے والا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ سر اور دونوں ہاتھ مل کر انسان ہوتا

Marfat.com

ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اگر سر نہ ہو تو انسان بھی نہیں رہتا، لیکن ہاتھ کٹا ہونے کی وجہ سے انسانیت سے خارج نہیں ہوتا۔ اسی طرح کہہ سکتے ہیں کہ تسبیحات اور تکبیریں اگرچہ جزو نماز ہیں لیکن ان کے نہ ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایمان میں دل کی تصدیق بمنزلہ آدمی کے سر کے ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ایمان بھی نہ ہو، اور دوسرے اعمال مثل آدمی کے ہاتھ پاؤں کے ہیں کہ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ "لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن" (بخاری ومسلم) تو صحابہ نے اس حدیث سے معتزلوں کا مذہب اعتقاد نہیں کیا کہ زنا کے باعث آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا ایمان کامل اور تمام نہیں ہے جیسے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آدمی نہیں یعنی اس میں کمال انسانی نہیں۔ یہ غرض نہیں کہ ہاتھ پاؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے ماہیت انسانی بھی نہیں رہی۔"[1]

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ امام صاحب کا نقطۂ نظر کہاں تک صحیح ہے؟ اس تحریر سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن وفکر پر کلیتہً منطق وفلسفہ کا غلبہ ہے، اور اسے ہونا بھی چاہیے کہ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم مسلم فلسفی تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ عقائد واعمال کی تشریح وتوضیح، قرآن وسنت رسول کی روشنی میں کرنے کے بجائے اسے منطق وفلسفہ کے ترازو میں تولتے ہیں۔ مذکورہ تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن وفکر پر عصری مذہبی اختلافات کا شدید اثر پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ قرآنی آیات اور احادیث کی تشریح اس طور پر کرتے ہیں کہ اس سے اپنے مخصوص مسلک کا دفاع اور فرقۂ معتزلہ کے خیالات کی تردید ہو جائے۔

ہمارے اسلاف یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز فکر وعمل اس کے

---

[1] احیاء العلوم ج ۱ ص۷ (مطبع نول کشور)

Marfat.com

بالکل برعکس تھا۔ وہ ہر عقیدہ و عمل کا جائزہ قرآن مجید کی روشنی میں لیتے تھے اور اس کو سمجھ لینے کے بعد ایک سچے مومن کی طرح اس پر عمل پیرا ہو جاتے تھے۔ وہ نہ تو الفاظ کی لغوی بحثوں میں الجھتے تھے اور نہ آیات و احکام کی منطقیانہ توجیہ اور فلسفیانہ تاویل ہی کے عادی تھے کیونکہ ان کا دور مسعود، منطق و فلسفہ کی موشگافیوں سے پاک تھا۔ ان کا محبوب مسلک عمل اور حسن عمل تھا، اور وہی ان کے نزدیک روز آخرت فلاح و نجات کا ذریعہ تھا۔

منطقیانہ بحث و نزاع کا دور تو اس وقت سے شروع ہوا جب عمل کی روح رفتہ رفتہ مفقود ہوتی گئی، اور اذہان پر عقلی علوم یعنی منطق و فلسفہ کا غلبہ ہوتا گیا۔ اب ہر عقیدہ و عمل کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ قرآن مجید اور سنّت رسول کے بجائے منطق و فلسفہ کے خود ساختہ اصولوں کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم عمل سے دور جا پڑے۔ عقائد و اعمال میں طرح طرح کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں اور فلسفیانہ تشریحات کے نتیجے میں امت مسلمہ مختلف متخاصم مذہبی فرقوں میں منقسم ہو گئی، اور آج تک عقائد و اعمال کا یہ اختلاف اور مذہبی مناقشات کا سلسلہ جاری ہے۔

ہمارے جن اکابر علماء نے اعمال کو ایمان کا جزو قرار نہیں دیا ہے، اور اس کے احقاق و اثبات میں انھوں نے خواہ کتنے ہی منطقیانہ دلائل فراہم کر دیے ہوں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان کے اس نقطۂ نظر نے ملّت اسلامیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ عمل سے ... نانوں کی بے پروائی اور ارتکاب فسق و فجور کے پس پردہ ایمان و عمل کے متعلق ان کے غلط تصوّرات ہی کار فرما ملیں گے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت اس خیال کی قائل ہے کہ وہ کچھ بھی کریں مومن بہر حال رہیں گے اس لیے کہ وہ زبان سے اپنے مومن ہونے کا اقرار کرتے ہیں، رہا عمل تو وہ ایمان سے علٰحدہ ایک چیز ہے۔

اعمال جزو ایمان ہیں

سطور ذیل میں ہم آپ کو قرآنی آیات، احادیث نبوی اور علماء اسلام کی تحریروں کی روشنی میں بتائیں گے کہ اعمال ایمان کے جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اکابر علماء

کا جو گروہ اعمال کو ایمان کا جزو لازم سمجھتا ہے وہ حق پر ہے۔

قرآن مجید سے استشہاد

نزول قرآن سے قبل ایمان کا لفظ عربی زبان میں مستعمل ضرور تھا لیکن اس کی تنگنائے میں ایمان کے ان دقیق حقائق کی سمائی ممکن نہ تھی جو قرآن نازل کرنے والے کے پیش نظر تھے چنانچہ قرآن مجید نے ایمان کے معنوی دائرے کو وسیع کرنے کے لیے متعدد جگہوں پر تشریحی جملے استعمال کیے اور بعض جگہوں پر ایمان کی جگہ دوسرے الفاظ بھی استعمال کیے تاکہ اس کا حقیقی مفہوم متعین ہو جائے۔ ہم یہاں اظہار مدعا کے لیے قرآن پاک سے چند مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ مومن کی تعریف میں فرمایا گیا ہے:۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ ۝ (مائدہ: ۵۵)

بیشک تمہارا حامی و ناصر تو بس اللہ اور اس کا رسول ہے، اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور خشوع والے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

الٓمّٓ ۝ تِلْكَ آيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيمِ ۝ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ (لقمان: ۱-۴)

الم، یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں، ہدایت اور رحمت ان نیکوکاروں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں یہی لوگ اپنے رب کے فضل سے راہ ہدایت پر گامزن ہیں، اور یہی فی الواقع کامیاب اور بامراد لوگ ہیں۔

آخری آیت میں مومنین کی جگہ محسنین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور محسنین کے معنی آپ جانتے ہیں کہ عمل کرنے ہی کے نہیں بلکہ نہایت عمدہ طریقے پر عمل کرنے کے ہیں۔ پھر آگے محسنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ اور ایمان بالآخرۃ

Marfat.com

وہ بھی اعمال (اسلام) اور ایمان ہی کے زمرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بالکل اسی مفہوم کی حامل دوسری آیتوں میں محسنین کی جگہ مومنین کا لفظ ملتا ہے، مثلاً فرمایا:

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

طٰس، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں، ہدایت اور بشارت ان مومنین کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت میں چند الفاظ کو چھوڑ کر وہ تمام الفاظ بھی موجود ہیں جو محسنین والی آیت میں موجود ہیں، اور دونوں آیتوں کا مطلب بھی ایک ہے، کیا اس سے یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ پہلی آیت میں مومنین کی جگہ محسنین کا لفظ محض مومنین کی تشریح کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر بھی محسنین کی طرح مومنین کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں گنجائش نہیں کہ ان سب کا احاطہ کیا جائے۔

لفظ ایمان کی قرآنی تشریح و توضیح کے بعد بھی عمل کو ایمان کا جزو نہ ماننا اور اس کے لغوی مفہوم ہی کو حقیقی مفہوم قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اعمال، ایمان کے جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایمان کے نقد و نظر کا معیار اعمال ہی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کی بہت سی آیتوں میں ان لوگوں کے ایمان کی نفی کی گئی ہے جو غیر صالح اعمال کے مرتکب ہوں۔ ہم اس کی چند مثالیں قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (بقرہ: ۹۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور اس کے ماسوا ہر بات کا

Marfat.com

انکار کرتے ہیں (حالانکہ وہ جس چیز کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں) وہ حق ہی ہے جو مصدّق ہے اس کا بھی جو ان کے پاس ہے۔ کہہ دو کہ اگر تم واقعتہً مومن ہو تو پھر اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو؟

یعنی تمہارا عمل تمہارے ایمان کی نفی کرتا ہے۔ اگر تم صاحب ایمان ہوتے تو تم سے یہ فعل ہرگز صادر نہ ہوتا۔ تم اپنے آپ کو مومن بھی کہتے ہو اور انبیاء کو قتل بھی کرتے رہے ہو۔ ایمان کے ساتھ اس فعل کا اجتماع محال ہے۔

(۲) اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (بقرہ:۱۰۰)

اور جب کبھی انھوں نے کوئی عہد و پیمان کیا تو ان کے ایک فریق نے ضرور اسے پس پشت ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔

اس آیت میں نقضِ عہد کو ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے یعنی وہ مومن نہیں جس میں عہد و پیماں کا پاس و لحاظ نہیں ہے۔

(۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (بقرہ:۹۳)

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کر کے کہا "جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اسے پوری قوت سے پکڑ لو اور (باتوں کو) سنا کرو" انھوں نے (جواب میں) کہا "ہم نے سنا اور نافرمانی کی" اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا اُن کے دلوں میں رچ بس گیا تھا۔ کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان بھی کیا خوب ہے جو تم کو ایسی بری باتوں کا حکم دیتا ہے"۔

یہودی ہر طرح کی بداعمالیاں کرتے تھے حتیٰ کہ خدا کی نافرمانی میں بالکل چھوٹ تھے اور کھلم کھلا فعل شرک کا ارتکاب کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مومن بھی کہتے تھے۔ اس آیت میں ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہو تو تمہارا ایمان بھی کیا خوب ایمان ہے جو تم کو ایسے گندے افعال کے کرنے کا حکم دیتا ہے حالانکہ حقیقی ایمان کا ان بری باتوں سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے۔

Marfat.com

(۴) یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (بقرہ : ۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جتنا کچھ سود بھی (کسی کے ذمہ) باقی ہو اس کو چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو۔

اس آیت میں سودی کاروبار کرنے والوں کو مومن قرار نہیں دیا گیا ہے چنانچہ اس کے بعد والی آیت میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو سود لینے اور دینے سے باز نہیں آتا اسے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

(۵) قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (اعراف : ۸۵)

اس نے کہا "اے قوم کے لوگو! صرف ایک اللہ کی اطاعت و بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح اور روشن دلائل آگئے ہیں۔ پس (تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ) تم پورا پورا ناپو اور تولو، اور لوگوں کے مال میں کمی نہ کرو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فتنہ و فساد نہ پھیلاؤ اگر تم واقعی مومن ہو۔

اس آیت میں ایمان کے بعد ناپ تول میں کمی کرنے کو ایمان و عدل کے منافی بتایا گیا ہے اور اسے فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۶) وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ○ یَعِظُکُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ (نور : ۱۶، ۱۷)

اور تم نے جب اس بات کو سنا تھا تو یہ کیوں نہ کہا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے نکالیں معاذ اللہ، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو تنبیہ کرتا ہے کہ پھر ایسی حرکت دوبارہ نہ کرنا اگر فی الواقع تم ایمان والے ہو۔

Marfat.com

اس آیت میں بہتان تراشی کو خلاف ایمان قرار دیا گیا ہے۔

(۷) أَفَمَن كَانَ مُؤْمِنًا كَمَن كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ (سجدہ : ۱۸)

کیا جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی مانند ہو جائے گا جو فاسق ہو، دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں مومن کو فاسق کی ضد بتایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فاسق کے معنی نافرمان اور بدعمل کے ہیں۔ جب مومن فاسق کی ضد ہوا تو مومن کے معنی فرماں بردار اور نیکوکار کے ہوئے۔ اسی بات کو قرآن مجید میں ایک جگہ دوسرے اسلوب میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (حجرات : ۷)

لیکن اللہ نے تمہاری نظروں میں ایمان کو پسندیدہ بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں کو اس سے زینت بخشی ہے۔ اور (اسی طرح) کفر، بدعملی اور نافرمانی کو تمہاری نظروں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ ایسے ہی لوگ دراصل ہدایت یافتہ ہیں۔

یہ آیت ہم کو بتاتی ہے کہ کفر، فسوق اور عصیان ایمان کے منافی ہیں۔ کفر کے معنی انکار، فسوق کے معنی نافرمانی اور عصیان کے معنی کھلم کھلا ارتکاب جرم کے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان عناصر ثلاثہ کا اجتماع ایمان کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی مومن بھی ہو اور اس کا قلب، کفر، فسوق اور عصیان سے داغدار بھی ہو۔ مومن ان آلائشوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔ اسی کو آیت مذکورہ میں حبّ ایمان اور زینت ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مومن شرور اور ذنوب سے اس طرح دور بھاگتا ہے جس طرح ایک نفیس الطبع آدمی گندگی سے دور رہتا ہے اور اس سے نفرت کرتا ہے۔ اور ایمان اس کو اسی طرح محبوب ہوتا ہے اور اس کے قلب ودماغ کی زینت بنا ہوتا ہے جس طرح رنگ وبو پھول کی زینت ہے اور ہر خوش ذوق انسان کے دل میں اس کی محبت وطلب جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی بات کو ایک جگہ قرآن پاک میں "کتابت فی القلب" بھی کہا گیا ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ (مجادلہ : ۲۲)

Marfat.com

یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھتے ہیں کہ بعض مقامات پر ایمان لانے والوں کو "یَااَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور اس کے معاً بعد پھر "اٰمنوا" کا لفظ آتا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا (نساء: ۱۳۶)

اے ایمان والو، ایمان لاؤ۔

اس آیت کا پہلا ٹکڑا جو خطاب ہے اس سے مراد اقرار لسانی ہے اور دوسرا ٹکڑا (اٰمنوا) جو تکرار ہے اس کا مطلب عمل ہے یعنی اے لوگو جو زبان سے ایمان لائے ہو عمل سے بھی ایمان لاؤ۔ ایمان اور عمل کی اس حقیقت کو قرآن پاک کی اس آیت میں نہایت عمدہ طور پر بیان کیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات: ۴۹)

بیشک حقیقی مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کسی شک میں مبتلا نہ ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی مومن وہی ہے جو صرف زبان ہی سے ایمان نہیں لاتا بلکہ عمل سے بھی اس کا ثبوت دیتا ہے اور ثبوت یہی ہے کہ وہ ایمان کے بعد اللہ کی راہ میں جان اور مال دونوں سے جد و جہد کرتا ہے۔ فی الواقع سچے ایمان کی کسوٹی ایثار و عمل ہی ہے۔ جو شخص خدا کی راہ میں نہ جان کی پروا کرے اور نہ ہی انفاق مال سے گریز کرے اس کے مومن صادق ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ جان اور مال ہی دو ایسی چیزیں ہیں جن سے ایک انسان کو انتہائی قلبی تعلق ہوتا ہے اور جب جان و مال سے زیادہ عزیز ایمان ہو جائے تو پھر ایمان کے کامل ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ایمان ایک پوشیدہ قلبی حالت کا نام ہے اور اس کا جاننا اسی

Marfat.com

وقت ممکن ہے جب آدمی زبان سے اس کا اظہار کرے، لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ زبان سے ایمان کا اقرار کرے لیکن درحقیقت وہ مومن نہ ہو اس لیے صادق و کاذب کے درمیان فرق و امتیاز کا ذریعہ صرف عمل ہی ہو سکتا ہے۔ عمل ہی بتائے گا کہ کون اپنے دعوائے ایمان میں سچا ہے اور کون جھوٹا؟ قرآن پاک نے عمل ہی کو ایمان کے صدق و کذب کی کسوٹی قرار دیا ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ.

(ممتحنہ : ۱۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مہاجر عورتیں آئیں تو ان کے متعلق خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر لو، اللہ ان کے ایمان سے خوب باخبر ہے، پس اگر وہ امتحان کے بعد مومنہ ثابت ہو جائیں تو انھیں کفار کے حوالہ نہ کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان ایک پوشیدہ چیز ہے اور اس کا صحیح صحیح حال صرف خدا ہی جانتا ہے۔ انسان صاحب ایمان کے عمل ہی کو دیکھ کر اس کے متعلق کچھ جان سکتا ہے۔ مذکورہ آیت میں امتحان سے یہی مراد ہے کہ ان کے طرز عمل پر نظر رکھی جائے اور جب ان کے ظاہری اعمال سے معلوم ہو جائے کہ وہ واقعتہً مخلص اور مومن عورتیں ہیں تو پھر انھیں کفار کے حوالہ نہ کیا جائے۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ ایمان قلب کی ایک کیفیت یا صفت کا نام ہے اور اعضاء سے اس کا اظہار عمل ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب میں ایمان ہو اور اس کا اظہار اعمال سے نہ ہو۔ اگر خوف کے وقت دل کی دھڑکن کے ساتھ ہی اعضاء و جوارح میں لرزہ پیدا ہو سکتا ہے، خوشی کے وقت فرط مسرت سے چہرہ گلنار ہو سکتا ہے، امیدوں اور آرزوؤں کی کامرانی دیکھ کر باچھیں کھل سکتی ہیں اور دل کے مغموم ہونے سے چہرہ افسردہ و ملول اور آنکھیں اشک آلود ہو سکتی ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دل حرارت ایمان سے پرجوش ہو اور اعضاء و جوارح پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو۔

اگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو عمل کے جزو ایمان ہونے میں کسی طرح کا کوئی

شبہ ہو تو وہ قرآن مجید کی اُن تمام آیتوں پر ایک نظر ڈال لے جو "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے شروع ہوتی ہیں ہم یہاں بطور مثال چند آیات قرآنی درج کرتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝ (رعد-۲۹)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے خوش حالی اور نیک فرجامی ہے۔

ایک دوسری جگہ آیا ہے:

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (تین: ۶)

مگر ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لیے غیر منقطع بخشش ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر)

قسم ہے زمانے کی، انسان بڑے خسارے میں ہے بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق بات اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

قرآن پاک میں ہر جگہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ "وعملوا الصّٰلحٰت" کے جملے کا التزام خود بتا رہا ہے کہ ایمان اور عمل میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ میں یہاں آپ کی توجہ ایک اہم قرآنی نکتہ کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایمان اور عمل صالح کی جزا کو باغات اور نہروں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے یعنی جو ایمان لائے گا اور اچھا عمل کرے گا اس کو اُخروی زندگی میں بطور جزا باغات اور نہریں ملیں گی۔ اس پر تھوڑا ٹھہر کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف روز جزا کی تمثیل ہی نہیں ہے بلکہ معنوی طور پر ایمان اور عمل صالح کے تعلق اور اس کی افادیت و لزوم کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔

درخت کو دیکھیں کہ اس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ زمین کے اندر پیوست ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی طرف پھیل کر ایک سائبان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور بایں صورت وہ اپنے سائے اور پھلوں سے مخلوق خدا کو آرام و راحت پہنچاتی ہیں لیکن درخت کی شادابی

Marfat.com

اور اس کی راحت رسانی نہروں کے وجود پر منحصر ہے۔ اگر درخت کو پانی نہ ملے تو درخت نہ سرسبز و شاداب رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے پھل پھول سے انسان کو کوئی لطف و راحت پہنچا سکتا ہے۔

یہی حال ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ نخل ایمان کی جڑیں قلب کی گہرائیوں میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں (اعمال) باہر پھیل کر اس کے وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔ جس طرح باغ کا وجود پانی پر منحصر ہے اسی طرح نخل ایمان بھی صرف اسی صورت میں شاداب رہ سکتا ہے اور بندگانِ خدا کو ثمر ایمان کی حلاوتوں سے شاد کام کر سکتا ہے جب اعمال صالحہ کی نہریں اسے برابر سیراب کرتی ہوں۔ اگر اعمال صالحہ کی نہریں نہ ہوں تو شجر ایمان نہ پھل پھول لا سکتا ہے اور نہ ہی زیادہ دنوں تک اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اچھا درخت اچھی زمین میں پھل نہ دے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ نخل ایمان کی جڑیں قلب سلیم میں موجود ہوں اور وہ پھولوں اور پھلوں (اعمال صالحہ) سے محروم ہو۔ جس طرح درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح حقیقی ایمان کی شناخت کا ذریعہ اچھے اعمال ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

> "کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور برا درخت برا پھل لاتا ہے ۵ اچھا درخت برا پھل نہیں لا سکتا نہ برا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے ۵ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے ۵ پس ان کے پھلوں سے تم ان کو پہچان لو گے۔" (متی، باب: ۷ا تا ۲۰)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر اعمال جزو ایمان ہوتے تو پھر امنوا کے بعد وعملوا الصٰلحٰت کے جملے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور ایمان پر اعمال کا عطف لاحاصل ہوتا اور تکرار کہلاتی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ ایمان کے معنی تصدیق اور ایقان کے ہیں لیکن دینی اصطلاح بن جانے کے بعد اس کے مفہوم میں کافی وسعت پیدا ہو گئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ ہی اس کے اصطلاحی مفہوم کو بھی جگہ جگہ واضح کر دیا جائے تاکہ اہل ایمان کو اس لفظ کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے اور وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ لفظ ایمان سے اللہ کا مقصود کیا ہے؟ اگر اس لفظ کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت نہ کی جاتی تو یہ اپنے لغوی معنی ہی میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسی لیے قرآن پاک میں جہاں کہیں "ان الذین امنوا" کا جملہ آیا ہے اسی سے متصل "وعملوا الصلحت" کا جملہ بھی موجود ہے۔ یہ دراصل "امنوا" کی تشریح ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حمید الدین فراہی فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں ایمان کے بعد جو عمل صالح کا ذکر آتا ہے وہ درحقیقت ایک طرح کی توضیح و تفصیل ہوتی ہے۔ اور اس کی نوعیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو عطف خاص علی العام کی ہے۔ قرآن مجید میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطاعت رسول کو اطاعت اللہ پر عطف کیا ہے۔ یہ بھی عطف تفصیل ہے۔ کل کے بعد جزو اور عام کے بعد خاص کا ذکر کر کے تفصیل کی جاتی ہے کیونکہ بعض الفاظ کے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو پوری طرح کھول دیا جائے۔ ایمان کے معاملہ میں اس توضیح کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ ایمان کا محل دل اور عقل ہے، اور عقل و دل کے معاملہ میں انسان نہ صرف دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہے بلکہ بسا اوقات خود بھی دھوکے میں رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مومن ہے حالانکہ وہ مومن نہیں ہوتا۔ اس لیے ایمان کے دو شاہد قرار دئے گئے ایک قول اور دوسرا عمل، چونکہ قول بھی جھوٹ ہو سکتا ہے اس وجہ سے صرف زبان سے اقرار کرنے والا مومن قرار نہیں دیا گیا بلکہ ضروری ہوا کہ آدمی کا عمل بھی اس کے ایمان کی تصدیق کرے۔ پس عمل ایمان کی کسوٹی ہے۔"[1]

[1] تفسیر سورہ والعصر - صفحہ ۳۲

"امنوا" کے بعد "وعملوا الصّٰلحٰت" کا جملہ صرف ایمان کی توضیح وتفصیل ہی نہیں کرتا بلکہ ایمان اور عمل کے درمیان جو پوشیدہ ربط وتعلق ہے اس کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح کے ربط وتعلق کی دوسری مثالیں بھی قرآن مجید میں موجود ہیں، مثلاً اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ اس آیت میں درجہ بدرجہ اس تعلق کو واضح کیا گیا ہے جو اطاعت اللہ، اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر میں پایا جاتا ہے یعنی اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی لازم ہے کیونکہ وہ اللہ ہی کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے، اور اسی طرح اولی الامر کی اطاعت بھی مسلمانوں پر اس وقت تک لازم ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی راہ پر گام زن ہے۔

اس ربط وتعلق کی دوسری مثال اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ پر واٰتوا الزکوٰۃ کو عطف کر کے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کے گہرے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بیشتر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ امر ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا وجود لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں کسی طرح کی تفریق جائز نہیں ہے۔ یہی حال 'امنوا وعملوا الصّٰلحٰت' کا بھی ہے۔ اس میں وعملوا الصالحات کا جملہ ایمان کے ساتھ اس کے لازمی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

احادیث سے استشہاد

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> "ایمان کے ستر سے اوپر شعبے ہیں۔ ان میں سب سے افضل لاالٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کا جز ہے۔"[1]

---

[1] بخاری و مسلم۔

Marfat.com

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ :

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی ہم سے خطاب فرمایا تو کم ہی ایسا ہوا ہے کہ آپ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں، اور اس شخص میں دین نہیں جو عہد کا پابند نہیں"۔[۱]

حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ :۔

" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ شخص مومن نہیں جو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے"۔[۲]

حضرت معاذ بن جبل ؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب افضل ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

" افضل ایمان یہ ہے کہ تم اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت کرو اور اللہ ہی کے لیے کسی سے بغض ونفرت رکھو اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں لگائے رکھو"۔ حضرت معاذ ؓ نے عرض کیا" اور کیا یا رسول اللہ ؟" آپ نے فرمایا " دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے بھی اس کو ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرتے ہو"۔[۳]

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

" ایمان والوں میں زیادہ کامل الایمان وہ شخص ہے جس کا اخلاق ان میں سب سے بہتر ہو"۔[۴]

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نظر میں اس کے ماں باپ اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔[۵]

---

[۱] بیہقی فی شعب الایمان [۲] ایضاً [۳] احمد [۴] ابوداؤد، دارمی [۵] بخاری و مسلم

Marfat.com

بخاری ہی میں ایک دوسری روایت عبداللہ بن ہشامؓ سے ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"ہم ایک دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ اپنے دست مبارک میں تھام رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے "یارسول اللہ لانت احب لی من کل شئی الا نفسی التی بین جنبی (یارسول اللہ آپ مجھے سوا اپنی جان کے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔) آپ نے فرمایا لا والذی نفسی بیدہ حتی اکون احب الیك من نفسك" (اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ایسا نہیں جب تک کہ میں تم کو تمہاری جان سے بھی عزیز نہ ہو جاؤں) حضرت عمرؓ نے فرمایا "واللہِ لانت احب الیّ من نفسی" (خدا کی قسم آپ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں) آپ نے فرمایا "الآن عمر" (عمر اب ایمان کا معاملہ پورا ہو گیا)

حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ہمارے ایمان و عمل کا سرچشمہ ہے۔ محبوب سے سچی محبت کی علامت کیا ہے؟ یہی کہ محبت کرنے والا اس کے ہر ایک فعل کا کامل اتباع کرے اور اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دے، اور کبھی کوئی ایسا کام نہ کرے جو اس کے محبوب کی مرضی اور پسند کے خلاف ہو بلکہ ہمیشہ وہ کام کرے جس سے محبوب کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل ہو سکے، غرض یہ کہ تن من سے اس کا جاں نثار بن جائے۔ زبان سے محبت کا دعویٰ کرنا اور محبوب کی کوئی بات بھی نہ ماننا اور ہر وہ کام کرنا جو محبوب کی نظر میں ناپسندیدہ ہو، صریحاً ریاکاری ہے۔

ایک روایت حضرت ابوامامہؓ سے بھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "ایمان کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "جب تمہیں اپنے اچھے کام سے خوشی اور برے کام سے تکلیف اور افسوس ہو تو تم مومن ہو۔" اس نے عرض کیا "گناہ کیا چیز ہے؟" فرمایا "جب تیرے دل میں کوئی چیز تردّد پیدا کرے اور مشتبہ معلوم ہو تو

اسے چھوڑ دے۔"[1]

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی یعنی اچھے کام کو ایمان قرار دیا ہے اور برے فعل کو ایمان کی ضد یعنی گناہ بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند لفظوں میں ایمان اور نیکی و بدی کے متعلق جو بصیرت افروز اور دانش مندانہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ ایمان کے حقیقی مفہوم اور نیکی و بدی کی حقیقت کو بالکل واضح کر دیتی ہے اور نیکی و بدی کے متعلق تمام جدید و قدیم فلسفیانہ توجیہات سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے۔

علماءِ اسلام کی تحریروں سے استشہاد

علماءِ اسلام کی اکثریت اسی بات کی قائل ہے کہ اعمال ایمان کے جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم امام بخاریؒ کی رائے نقل کر چکے ہیں[2] حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

"بیشک تو زبان سے کہتا ہے کہ کوئی معبود نہیں سوا اللہ کے اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں مگر جان لے کہ اس سے تجھ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یاد رکھو ایمان کے دو جزو ہیں، ایک قول اور دوسرا عمل۔ قول اس وقت تک نفع نہ دے گا جب تک کہ دوسرا جزو یعنی عمل بھی نہ ہو۔ اگر تو گناہ کرتا چلا جائے، خدا کی مخالفت پر اڑا رہے اور برائیوں پر اصرار کرتا رہے، نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور خیر خیرات سے غافل رہے، غرض یہ کہ نیکی کے سارے کاموں کو طاق نسیاں میں ڈال کر صرف ان زبانی گواہیوں پر اکتفا کرے تو اس سے تجھے قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچے گا تیری یہ زبانی شہادت دلیل کی طالب ہے، تو معبود کسی کو کہہ رہا ہے اور اطاعت کسی کی کر رہا ہے۔"[3]

---

[1] احمد۔ [2] فرماتے ہیں ھو (ایمان) قول وفعل یزید وینقص۔ [3] خطبات غوث الاعظم صفحہ ۳۶، ۷۲

ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں:

"کیا یہ بات افسوسناک نہیں ہے کہ تمہاری زبان تو مسلمان رہے اور فعل کافر، جلوت میں تو مسلمانی کی بہار ہو اور خلوت میں کفر کی خزاں تمہاری روح کے گلشن پر طاری ہو۔"[۱]

مولانا ابو الکلام آزادؒ ایمان کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم کو کامیابی نہیں مل سکتی ہے۔ اس کی سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ تمہارے اندر ایمان، یقین، اطمینان، جماؤ، تسکین اور اقرار پیدا ہو۔ لیکن کیا محض دل کا یہ کام، دماغ کا یہ فعل اور تصور کا یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں، ایک دوسری منزل بھی اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کر لوگے صرف پہلی منزل کو طے کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس دوسری منزل کا نام قرآن مجید کی بولی میں عمل صالح ہے یعنی وہ کام جو اچھا ہے، جسے اچھائی کے ساتھ کرنا ہے۔ سچائی اور صحیح طریقے سے انجام دینا ہے۔"[۲]

مولانا سید سلیمان ندویؒ عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلام، ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت و سبب ہے۔ یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر کوئی ایسا شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں ایمان کے مطابق کوئی تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ایمان

---

[۱] خطبات غوث الاعظم ص ۵۱ [۲] آزاد کی تقریریں ص ۱۰۸، ۱۰۹

Marfat.com

نے اس کی زبان سے اُتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومن کا وصف لازم بتاتا ہے۔"[1]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو عمل صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی اُمید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے۔ جب وہ اس دعویٰ کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے جب تک بیج زمین میں نہ ہو کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جتنی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عمل صالح کریں۔"[2]

جزائے اعمال

جزائے اعمال کی دو صورتیں ہیں، ایک دنیوی جزا اور دوسری اُخروی جزا۔ توریت میں اعمال حسنہ کی جو جزا بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کو اسی دنیا میں مال و دولت، جاہ و حشم

---

[1] سیرت النبی، جلد چہارم صفحہ ۶۸۲۔

[2] تفہیم القرآن، جلد ششم تفسیر سورہ والعصر، صفحہ ۴۵۳۔

Marfat.com

اور ملک وحکومت حاصل ہو جائے [1] گویا اس کے یہاں جزا کا تصوّر بالکل دنیاوی ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں جزا کا جو تصوّر دیا گیا ہے وہ خالص اُخروی ہے یعنی آسمانی بادشاہی [2] قرآن مجید کا نقطۂ نظر دیگر امور کی طرح اس معاملے میں بھی عقلی اور روحانی دونوں اعتبار سے زیادہ جامع اور کامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مومن کے لیے اِس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور اُس دنیا (دار آخرت) میں بھی عمدہ جزا ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا ہے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۟ (آل عمران : ۱۴۸)

اللہ نے اُنھیں دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بہترین اجر بھی، اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (نحل ۹۷)

جس نے اچھا کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اسے ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کے تمام وسائل فراہم کریں گے۔ اور اُن کے کاموں پر ہم اُن کا بہترین اجر انھیں عطا کریں گے۔

دنیوی جزا

اس دنیا کی جزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ مومن کو ذلّت و مسکنت، تنگیٔ معاش اور بے خوفی و بے اطمینانی کی جگہ عزت و سروری، فراخیٔ رزق اور ذہنی و قلبی اطمینان و سکون حاصل ہو جائے لیکن ایک مومن کے لیے دراصل سب سے عمدہ جزا یہ ہے کہ اس کی زندگی ایک پاکیزہ اور نیکوکار انسان کی زندگی ہو جائے اور اسے روحانی مسرّت اور قلبی سکون کی وہ دولت بے بہا مل جائے جس کے مقابلے میں دنیا کا ہر سامانِ لطف

---

[1] استثناء باب ۲۸: ۱تا۱۰ [2] متی باب ۵: ۲۰-۱۹

و راحت ناچیز ہے۔ روحانی مسرّت اس کے سوا اور کیا ہے کہ مومن کا قلب ہر طرح کی حرص و ہوا، بغض و حسد اور حزن و ملال کے داغ دھبّوں سے پاک صاف ہو۔ کسی آدمی کو دنیا کا ہر سامانِ عیش و تنعم مل جائے لیکن اس کے قلب کو اطمینان و سکون اور اس کی روح کو مسرّت و شادمانی حاصل نہ ہو تو مادّی نعمتیں اور ہر طرح کی عزّت و سربلندی اس کے لیے بے کار و بے سود ہے۔ قلبی تسکین اور روحانی انبساط ایک ایسی سعادت ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ہر صالح اور نیکوکار بندے کو نوازتا ہے۔ اسی کو آیت مذکورہ میں حیات طیّبہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ تو ایک مومن کی انفرادی جزا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی جماعت کو اجتماعی جزا سے بھی نوازتا ہے اور یہ زمین میں غلبہ و اقتدار ہے :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور : ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے اور اچھا عمل کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں زمین کی خلافت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو خلافت عطا کی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض خدا کی وہ بہترین جزا ہے جس سے وہ اس دنیا میں مومنوں کو نوازتا ہے۔ استخلاف فی الارض کا جملہ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صرف کسی خطّۂ ارض پر حکومت نہیں ہے بلکہ زمین کے ایک بڑے حصے پر غلبہ و اقتدار اعلیٰ مراد ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھیں دنیا کی تمام طاقتوں پر بالا دستی حاصل ہوتی ہے۔

اس آیت سے بعض حضرات بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ آج زمین کے ایک بڑے حصّے پر ان لوگوں کی حکومت ہے جو ایمان اور عمل صالح سے محروم ہیں، بلکہ بعض ملکوں جیسے روس و چین وغیرہ میں ایسی جماعتیں برسر اقتدار ہیں جو نہ صرف ایمان اور اعمال صالحہ سے تہی دامن ہیں بلکہ خدا کے وجود کی بھی قائل نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خود کو مومن کہنے والے اگرچہ بعض جگہوں پر ملک و حکومت

Marfat.com

کے مالک ضرور ہیں لیکن کفار اور فاسقین کے مقابلے میں پست و کمزور ہی نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات میں ان کے محتاج و دست نگر بھی ہیں۔ کم نظر اور کوتاہ فہم لوگ اس صورت حال کے پیش نظر استخلاف فی الارض کی عجیب وغریب تاویلات کرتے ہیں اور جو لوگ جہل و کوری میں مبتلا ہیں وہ وعدۂ خداوندی کی صداقت کے بارہ میں مشکوک ہو جاتے ہیں۔

یہ دنیا دارُالعمل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز خواہ وہ مال و دولت ہو، خواہ صحت و قوت، خواہ عزت و شہرت اور خواہ ملک و حکومت، سب کے حصول کے لیے ایک ضابطہ اور قانون مقرر فرما دیا ہے، اور یہ کسب وسعی کا قانون ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ (انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے) کسب وسعی کا یہ قانون ہر فرد اور جماعت کے لیے یکساں ہے، اس میں مومن و کافر کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اگر ایک کافر اور منکر خدا بھی زمین میں تخم ریزی کرتا ہے اور اس کے بارآور ہونے کے تمام اسباب و وسائل فراہم کرتا ہے اور ہر طرح کی محنت و مشقت کرتا ہے تو زمین سے غلہ ضرور پیدا ہوگا۔ زمین صرف اس بنا پر اس کی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہونے سے نہیں روک دے گی کہ بیج ڈالنے والا ایک کافر و منکر ہے۔ زمین سے غلہ اُگانے کے لیے جو قانون اور ضابطہ حکیم مطلق نے بنا دیا ہے اگر اس کی پیروی ایک کافر و منکر بھی کرتا ہے تو وہ اس دنیا میں اپنے عمل اور سعی و محنت کے نتائج سے محروم نہیں رہ سکتا یہی حال ہر کسب خیر کا ہے۔

زمین پر غلبہ و اقتدار کا معاملہ بھی اسی کے تابع ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں عروج و سربلندی اسی قوم کو ملتی ہے جو نظم و اتحاد، صبر و ثبات، عزم و استقلال، جہد مسلسل اور ایثار و قربانی کے اوصاف سے متصف ہوتی ہے، اور جو قوم عروج کے ان عناصر ترکیبی سے محروم ہوتی ہے اس کے خانۂ تقدیر میں ذلت و نکبت اور محتاجی و غلامی لکھ دی جاتی ہے۔

عہد رسالت کی ساری ظفرمندیاں اور دور خلافت کی ساری عظمت و سربلندیاں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے سوز یقین، جوش عمل، صبر و ثبات، ایثار جان و مال اور خدا کی ذات پر غیر متزلزل اعتماد و توکل کا نتیجہ تھیں۔ دنیا میں آج بھی جو قوم بام عروج پر فائز

ہے اس کا سبب بھی ان کا قومی اتحاد، ذہنی بیداری، حربی علوم میں ان کا تفوق اور ایثار و قربانی ہے۔ جرمن اور جاپانی قوم اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ روس اور امریکہ کی معاشی قوت اور حربی برتری کا راز بھی اسی جہدِ مسلسل میں پوشیدہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزل و نصب کا ایک متعین قانونِ الٰہی ہے اور تاریخ کے ہر دور میں عروج و زوال کا یہ قانون بلا امتیازِ ملک و قوم اور مذہب و مسلک اپنا کام کرتا رہا ہے۔ اگر کوئی انسانی جماعت زوال یعنی اختلاف و انتشار، بزدلی و بے غیرتی، عجلت و بے صبری، ذہنی و فکری جمود و تعطل (Mental Stagnation) اور عیش کوشی و نفس پرستی کی راہ میں گام زن ہو جائے تو اسے یقیناً شکست و نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ قانونِ زوال کے نتائج یعنی ذلت و نکبت سے صرف اس وجہ سے نہیں بچ جائے گی کہ وہ اعتقاداً مسلم ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انسانی جماعت عروج کی راہ میں گام زن ہے یعنی اتحاد و اتفاق، عقلی بیداری اور سخت کوشی و جاں فروشی کا مظاہرہ کرتی ہے تو وہ صرف اس وجہ سے اپنے ایثار و عمل کے ثمرات سے محروم نہ رہ جائے گی کہ وہ کافروں اور منکروں کی جماعت ہے۔

بلاشبہ اگر انسانوں کی کوئی ایسی جماعت تیار ہو جائے جو صحیح معنوں میں مومن و مسلم ہو اور ساتھ ہی جاں فروشی کے لیے بھی کمربستہ ہو تو دنیا کی ہر قوم خواہ وہ مادی عروج و اقبال کے کسی مقام پر بھی فائز ہو، اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی کیوں کہ اس جماعت کے ساتھ ہمیشہ خدا کی نصرت و حمایت ہوتی ہے اور جس قوم کو خدا کی نصرت و حمایت حاصل ہو جائے اسے کون شکست دے سکتا ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ (آل عمران: ۱۶۰)

اور اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

آج زمین پر کفار و منکرین کا غلبہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلم قوم اس معیار پر پوری نہیں اتری یعنی ایمان اور عمل صالح کے معیار پر، جو اللہ نے اسے زمین کی خلافت عطا کرنے کے لیے معین کر رکھا ہے۔ زمین پر کفار و منکرین کو غلبہ دے کر اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر

Marfat.com

یہ واضح کردینا چاہتا ہے کہ زمین کی خلافت ان کا کوئی پیدائشی حق نہیں ہے کہ وہ خواہ کیسی ہی سیرت و کردار کے مالک ہوں، زمین پر غلبہ و اقتدار اعلیٰ بہر حال انہی کو حاصل ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امام عالم بناتے وقت ان کے اس سوال " ومن ذریتی "؟ کے جواب میں ارشاد فرمائی ہے۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ: ۱۲۴)

میرا عہد ظالموں کے ساتھ نہیں ہے۔

فی الواقع اللہ تعالیٰ اس دنیا میں غلبہ و اقتدار اسی قوم کو عطا کرتا ہے جو اس کی اہل ہوتی ہے کسی نا اہل کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے سرفراز نہیں کرتا، اور جب اہل بھی نا اہل ثابت ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے زمین کا اقتدار چھین لیتا ہے۔ فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (انفال: ۵۳)

اللہ کی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے طرز عمل کو نہیں بدل دیتی۔

جس اہلیت کی بنیاد پر کسی قوم کو زمین کا وارث بنایا جاتا ہے اس کی دو شرطیں ہیں، ایک ایمان و عمل صالح اور دوسری کسب وسعی۔ اگر کوئی قوم بھی ان دو شرطوں پر پوری نہیں اترتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ زمین کا اقتدار اس قوم کے سپرد کرتا ہے جو کسب وسعی اور اہلیت کے اعتبار سے دوسری قوموں پر برتری رکھتی ہے۔ یہ وہ قانون قدرت ہے جو روز ازل سے متعین ہے اور کسی حال میں بھی تبدیل نہیں ہوتا:۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (احزاب: ۶۲)

اور تم اللہ کے طریقے میں ہرگز تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اُخروی جزا

ایک مومن کے اعمال حسنہ کی دوسری جزا اُخروی ہے یعنی بہشت جاوداں۔ اخروی

Marfat.com

جزاہی مومن کی اصل جزائے عمل ہے کیوں کہ وہ غیر منقطع اور غیر فانی ہے۔ اس جزا کا ذکر قرآن مجید میں کثرت سے آیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ؀ (نساء: ۱۲۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ؀ (اعراف: ۴۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، اور ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ؀ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ؀ (طٰہٰ: ۷۶)

اور جو شخص اس کے پاس مومن بن کر اچھے اعمال کے ساتھ آئے گا اس کے لیے بلند درجات ہیں، ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی جزا ہے ہر اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔

اُخروی جزا کا مادّی تصوّر

اُخروی جزا کا ایک تصوّر تو قرآن نے وہ دیا ہے جس میں جنّت کی پر بہار نعمتوں اور اس

کی دلربا آسائشوں کا ذکر ہے یعنی گھنے باغات، رواں چشمے، ظلّ ممدود، انواع واقسام کے پھل، لذیذ ودل پسند مشروبات، پری تمثال حوریں، حاضر باش غلام وخدّام، تحیات وسلام سے معمور فضائیں اور بے تکلف آراستہ محفل احباب وغیرہ۔ یہ تصوّر جزا تمام تر مادّی ہے۔

ان نعمتوں کا ذکر قرآن مجید نے ایک جگہ بڑے دل کش اسلوب میں کیا ہے:

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡهَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۱۶﴾ یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿ۙ۱۷﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿ۙ۱۸﴾ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ﴿ۙ۱۹﴾ وَ فَاکِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ﴿ۙ۲۰﴾ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ ﴿ؕ۲۱﴾ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿ۙ۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُوٴِ الۡمَکۡنُوۡنِ ﴿ۚ۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ﴿ۙ۲۵﴾ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ وَ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡنِ ﴿ؕ۲۷﴾ فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ﴿ۙ۲۸﴾ وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿ۙ۲۹﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ﴿ۙ۳۰﴾ وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ ﴿ۙ۳۱﴾ وَّ فَاکِهَةٍ کَثِیۡرَةٍ ﴿ۙ۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَةٍ ﴿ۙ۳۳﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ ﴿ؕ۳۴﴾ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ﴿ۙ۳۵﴾ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡکَارًا ﴿ۙ۳۶﴾ عُرُبًا اَتۡرَابًا ﴿ۙ۳۷﴾ (واقعہ: ۱۵-۳۷)

وہ لوگ زرنگار تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اور لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، ان کی خدمت میں آبخورے، آفتابے اور شراب سے لبریز جام لیے ہوئے ہمہ آن مصروف گردش ہوں گے۔ (شراب کے یہ جام پی کر) نہ ان کو درد سر لاحق ہوگا اور نہ اس سے ان کی عقلوں میں کوئی فتور واقع ہوگا (اور ان کے علاوہ ان کے لطف وراحت کے لیے) دل پسند میوہ جات اور چڑیوں کے گوشت اور ایسی آہو چشم عورتیں ہوں گی جیسے پوشیدہ رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ ان کے اعمال کے صلہ میں ان کو ملے گا (ان تمام اسباب عیش وراحت کے باوجود) وہاں وہ لغو اور گناہ کی کوئی بات نہ سنیں گے۔ بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی صدائے دل نواز سنائی دے گی۔

داہنے ہاتھ والے اور کیا ہی اچھے ہیں داہنے ہاتھ والے، وہ ان باغوں میں

Marfat.com

ہوں گے جہاں بے خار بیریاں، تہ بر تہ کیلے، پھیلے ہوئے سائے، آب رواں اور کثرت سے پھل ہوں گے جو نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ ان کے کھانے پر کوئی روک ٹوک ہوگی۔ اور اونچے اونچے فرش ہوں گے اور ایسی عورتیں وہاں ہوں گی جن کو ہم نے خاص طور پر بنایا ہوگا۔ وہ ہمیشہ کنواری ہی رہیں گی، شوہر سے محبت کرنے والی اور ہم سن ہوں گی۔

دوسری جگہ آیا ہے

وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۚ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۙ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۚ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۙ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۚ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۚ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (دہر: ۱۱تا۲۲)

اور ان کو تازگی اور خوشی عطا کرے گا (یعنی چہروں کو تازگی اور قلوب کو مسرت عطا کرے گا) اور ان کو خیالات و عمل کی استقامت کے نتیجے میں جنت اور لباس حریر بخشے گا۔ اور وہ جنت میں تختوں پر گاؤ تکیہ لگائے ہوں گے۔ نہ وہاں گرمی کی تپش ہوگی اور نہ جاڑے کی ٹھر (بلکہ معتدل موسم ہوگا) جنت کے درختوں کے سائے ان کے اوپر دراز ہوں گے اور پھلوں کے خوشے ان کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے (یعنی ہر وقت بلا کسی مشقت کے لے سکیں گے) ان کی خدمت میں چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے ہمہ آن پیش کیے جائیں گے، شیشے بھی وہ جو چاندی کی

Marfat.com

قسم کے ہوں گے اور جن کو کارکنانِ بہشت نے مناسب اور موزوں اندازے کے مطابق بھرا ہوگا۔ وہاں ان کو ایسے جام شراب پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ شراب جنت کے ایک ایسے چشمہ سے لائی جائے گی جس کا نام وہاں سلسبیل مشہور ہوگا۔ ان کی خدمت میں ایسے لڑکے ہمہ آن مصروف گردش ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ اور جب تم ان کو دیکھو گے تو گمان کروگے کہ گویا یہ موتی ہیں جو بکھرے ہوئے ہیں۔ اور وہاں تم جہاں کہیں بھی نظر ڈالو گے تم کو ہر جگہ نعمتیں ہی نعمتیں اور ایک عظیم سلطنت کا جاہ و جلال نظر آئے گا۔ وہاں جنتی باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے زیب تن کیے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو نہایت ہی پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ ہے تمہارے اعمال کی جزا، اور تمہاری سعی و عمل کو آج شرف قبول حاصل ہوا۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے :۔

وَ اَمۡدَدۡنٰہُمۡ بِفَاکِہَۃٍ وَّ لَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ۝ یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡہَا کَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِیۡہَا وَ لَا تَاۡثِیۡمٌ۝ (طور: ۲۲، ۲۳)

اور ہم ان کو دل پسند میوے اور گوشت وافر مقدار میں فراہم کریں گے وہ (جنت میں ایسے خوش طبع اور بے تکلف ہوں گے کہ) جام شراب لینے میں باہم دگر مسابقت کریں گے لیکن نہ تو وہاں کوئی ہرزہ سرائی ہوگی اور نہ گناہ و گندگی کی کوئی بات۔

ان آیات میں انسانی آرزوؤں کی مرقع کشی بڑی جذبات انگیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ اور نادر پیرایۂ بیان میں عالم غیر مادّی یعنی آخرت کی مسرتوں کی تصویر کشی انسانی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ ان تینوں آیتوں کو ملا کر دیکھئے تو نشاط ہستی کی تصویر ہر پہلو سے مکمل نظر آتی ہے۔

انسان کی محنت اور اس کے اچھے کاموں کی اس سے بہتر اور کیا جزا ہو سکتی ہے کہ اس کا مسکن سرسبز و شاداب لہلہاتے ہوئے باغات ہوں، کھانے کے لیے لذیذ اور خوش مزہ پھل اور گوشت ہوں، سیرابیٔ کام و دہن کے لیے چشمۂ رواں کا صاف و

شیریں پانی اور بادۂ خوش رنگ کے چھلکتے ہوئے جام و ساغر ہوں، پوشش کے لیے حریر اور اطلس و دیبا کے کپڑے اور خدمت کے لیے چاق وچوبند خدام ہوں، سیر و تفریح کے لیے باغات کی سایہ دار روح پرور فضائیں اور نہروں کے کنارے، جہاں کی سحر صبح، صبحِ دل کشا اور سہر شام، شام طرب انگیز ہو۔ اگر ان نعمتوں کے ساتھ ہی خوش جمال اور خوش خصال رفیقۂ حیات اور بے تکلف محفل احباب بھی میسّر ہو تو پھر انسان کے لیے خواہش اور آرزو کرنے کے لیے کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی آرزوؤں کی اس سے بہتر تصویر کشی ممکن نہیں ہے۔

باغات اور نہروں کے کثرت ذکر سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ مسرّت کی یہ تصویر صرف عربوں کے مذاق و مزاج کی عکّاسی کرتی ہے۔ بلاشبہہ باغات اور چشمے عربوں کی غیر مدنی زندگی کی ساری مسرّتوں کا مرکز اور بقائے حیات کا ذریعہ تھے۔ لیکن یہ خصوصیت کچھ انہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ ماضی کی دوسری تمام اقوام کے نزدیک بھی باغات اور نہروں کا وجود، قیام و بقائے زندگی اور آسودگی قلب و نظر کا ایک عمدہ ذریعہ رہا ہے، اور یہی صورت آج بھی برقرار ہے۔

اخروی جزا کے مادی تصوّر کی حقیقت

ایک عام انسان اپنے اچھے اعمال کی جو بہتر سے بہتر جزا چاہ سکتا ہے یا بالفاظ دیگر لطف و مسرت کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی تخیّل ہو سکتا ہے قرآن نے اسے خوبصورت الفاظ اور دل کش اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔ اگر قرآن مجید انسانی اعمال کی جزا کو مادّی صورت میں پیش نہ کرتا تو عام انسانوں کے لیے اخروی زندگی اور اس کی مسرّتوں کا تصوّر ناقابل فہم ہوتا اور اس کی طلب و آرزو ان کے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی مادّی مسرّتیں تو ہیں جن کے حصول کے لیے وہ اس دنیا میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور ان کو پا جانے کے بعد وہ مطمئن اور شاد کام ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی محنتیں بار آور ہوئیں، گویا اس کے ہر ایک عمل کا محرک مادّی مسرّتوں کا حصول ہے۔ چنانچہ

قرآن حکیم نے بھی اعمالِ حسنہ کی جزا میں انہی مادی مسرتوں کو پیش کیا جن سے اس کے قلب و نگاہ آشنا ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے اندر جذبۂ عمل بیدار ہو اور وہ اس جہانِ فانی کی فانی مسرتوں کو چھوڑ کر اخروی زندگی کی لافانی مسرتوں کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل ہو سکے، اور اس حیاتِ فانی کی ہر کلفت و آزار کو اس حیاتِ جاوداں کے لطف و شادمانی کی امید میں ہنسی خوشی گوارا کر سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جنّت کی نعمتوں کا بیان انسانی فطرت اور مزاج کی رعایت سے کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ نعمتیں جن الفاظ میں بیان کی گئی ہیں وہ وہاں واقعتاً اسی شکل و انداز میں ملیں گی۔ اس عالمِ غیر مادّی کی نعمتوں کا جب بھی کوئی نقشہ کھینچا جائے گا لازماً وہی ہوگا جو عالمِ مادی میں موجود ہے۔ عالمِ غیر مادی کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان بھی کر دی جاتیں تو ہمارا فہم ان کے ادراک سے عاجز ہوتا۔ ہم عالمِ آخرت کی ہر نعمت کا تصوّر دنیاوی نعمتوں کی شکل ہی میں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں انسانی زبان کے تمام الفاظ مادّی خواص رکھتے ہیں یعنی ہم ان کے ذریعہ صرف عالمِ مادی کی نعمتوں کو ہی بیان کر سکتے ہیں، ان الفاظ کے ذریعہ عالمِ غیر مادی کی نعمتوں کی تصویر کشی ممکن نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جو ایک انسانی زبان میں نازل ہوا ہے، بہشت کی نعمتوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ حقیقی نہیں مجازی ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعہ ہم اخروی نعمتوں کا ایک دھندلا سا تصوّر قائم کر سکتے ہیں اور بس، رہی ان نعمتوں کی اصل حقیقت تو ہم اس کو اس دنیا میں صحیح طور پر نہیں جان سکتے جیسا کہ خود قرآن مجید میں آیا ہے:۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سجدہ: ۱۷)

آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ان کے رب نے ان کے اعمال کی جزا کے طور پر چھپا رکھا ہے، اس کی کسی متنفس کو بھی خبر نہیں ہے۔

اسی بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

Marfat.com

"خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے صالح اور نیکوکار بندوں کے لیے وہ سامانِ راحت تیار کر رکھا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔"[1]

اُخروی جزا کا غیر مادی تصوّر

قرآن مجید نے جزائے آخرت کے مادّی تصوّر کے ساتھ ہی اس کا ایک غیر مادّی تصوّر بھی پیش کیا ہے اور یہی حقیقی اور اصلی تصوّر ہے۔ اس تصورِ جزا کو صحیح طور پر صرف رازدارانِ محبت اور اربابِ فکر و نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس جزا کو رضائے الٰہی اور دیدارِ رب سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (توبہ: ۷۲)

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان ہمیشہ رہنے والے باغات میں ان کے لیے پرفضا اور دل کش رہائش گاہیں ہوں گی۔ اور ان سے بھی بڑی نعمت جو انھیں وہاں حاصل ہوگی وہ خود اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥

(فجر: ۲۷، ۲۸)

اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کے حضور میں اس طرح چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

---

[1] بخاری، مسلم، ترمذی (تفسیر سورہ سجدہ) رواہ ابوہریرہؓ

Marfat.com

ایک اور مقام پر فرمایا ہے :۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (قیامہ: ۲۲،۲۳)

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مومن صادق کے لیے باغات، نہروں اور عالی شان مساکن سے کہیں زیادہ مرغوب اور دل پسند نعمت باری تعالیٰ کی خوشنودی، اس کی رحمت و رضا اور اس کا قرب و دیدار ہے۔ سوچئے، ایک عاشق کی سب سے بڑی آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ یہی نا کہ اسے محبوب کا دیدار اور اس کا قرب و ملاقات حاصل ہو جائے۔ اور ایک عاشق پر محبوب کا سب سے بڑا لطف و کرم بھی یہی ہے کہ وہ اس کو اپنے دیدار سے مشرف کر دے، اور دو چار میٹھے بول بول کر اپنی رضا اور خوشنودی کا اظہار کر دے یہی محبت کا اصل مطلوب اور ایک سچے عاشق کی دلی آرزو ہوتی ہے۔ اس دیدار و ملاقات کے بعد ایام ہجر کی تمام کلفتیں اور روح فرسائیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور مسرت سے لبریز قلب شکیب آزما راہ محبت کا ہر رنج و غم بھول جاتا ہے۔ محبوب کا روئے تاباں، عاشق کے ہر زخم دل کا اس طرح مداوا بن جاتا ہے جیسے اس کے دل نے کبھی کوئی زخم کھایا ہی نہیں تھا۔

فی الواقع روز آخرت دیدار الٰہی اور قرب خداوندی سے یہی کیفیت مومنوں کے اوپر بھی طاری ہوگی۔ یہ وہ روز سعادت ہے جس کی تمنا ہر اس مومن صادق کے دل میں پائی جاتی ہے جو رمز محبت سے آشنا اور قرب و دیدار کے مفہوم سے واقف ہے، جس کے نزدیک باغات، نہروں اور حور و قصور سے زیادہ محبوب شئے خود پروردگار کا دیدار و قرب ہے۔

باری تعالیٰ کے دیدار کی حقیقت کیا ہے، یہ انسانی عقل و فہم کے لیے ناقابل ادراک ہے۔ اسی لیے ہر انسان کے دل میں اس کی طلب و آرزو کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز آخرت کی اس جزا کا ذکر قرآن نے اتنی شدت کے ساتھ نہیں کیا ہے جتنی شدت کے ساتھ اس نے مادی مسرتوں یعنی باغ و نہر، لباس و طعام، حور و قصور اور دیگر اسباب راحت کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ یہ نعمتیں دیدہ و شنیدہ ہیں اور ان کی طلب

Marfat.com

ہر انسان کے دل میں فطرۃً موجود ہوتی ہے۔ رہے رموزِ محبت یعنی قرب و دیدار کی حقیقت تو اس سے ہر نظر مانوس اور ہر قلب آشنا نہیں ہوتا، لیکن قرآن مجید نے اس کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ رہ روانِ راہ محبت تیز گام ہوں اور ان کے قلوب کو بھی سامان تسکین مل سکے۔ کون کس راہ پر چلے اور کس جزا کا طلب گار بنے یہ ہر ایک کی استعداد ذہنی، مذاق طبیعت اور حسن طلب پر موقوف ہے۔

عمل غیر صالح کا مفہوم

جیسا کہ ہم عمل صالح کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کے وہ تمام اعمال جو عدل وقسط سے متجاوز اور اس کے لیے اور سماج کے لیے مضرت رساں ہوں یا دوسرے لفظوں میں اللہ کی رضا و خوشنودی کے خلاف ہوائے نفس کے اتباع میں کیے گئے ہوں، اعمال غیر صالحہ میں داخل ہیں مثلاً شرک، قتل ناحق، زنا، چوری، رہزنی، شراب نوشی، امرد پرستی، قمار بازی، فحش گوئی، دروغ اور بہتان طرازی، جھوٹی شہادت، خیانت، دجل و فریب اور ظلم و عدوان وغیرہ۔ ان اعمال کی مضرتوں سے نہ تو ان کا ارتکاب کرنے والا محفوظ رہتا ہے اور نہ معاشرہ۔ پوری تاریخ انسانی ان افعال بد کے تباہ کن نتائج سے بھری پڑی ہے۔

کیا ایمان کے ساتھ اعمال غیر صالحہ کا اجتماع ممکن ہے؟

گزشتہ صفحات میں ہم آپ کو یہ بتا چکے ہیں کہ ایمان کا دوسرا نام علم ہے۔ علم اس روشنی کا نام ہے جو انسان کے قلب و دماغ کی ظلمتوں کو دور کر کے اس کو صحیح اور غلط اور اچھے اور برے میں امتیاز کی صلاحیت عطا کرتی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۃ (بقرۃ: ۲۵۷)

اللہ ایمان لانے والوں کا کارساز ہے۔ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

علم ہی کے ذریعہ ایک انسان غلط افعال کے نقصان دہ نتائج سے بچتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے۔ آگ کے متعلق ہمارے اس علم کا نتیجہ

ہے کہ ہم بقید ہوش و حواس آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اسی طرح اگر ہم سے کوئی کہے کہ پہاڑ سے کود جاؤ تو ہم ایسا کبھی نہ کریں گے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ سے کودنا ہلاکت کا باعث ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کے نتائج کا علم ہی ہم کو غلطیوں سے بچاتا ہے اور ہم بہت سے نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں۔

جب صورت واقعہ یہ ہے تو پھر یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ ایمان کی روشنی سے قلب و دماغ منوّر ہوں اور اس کے باوجود ایک مومن وہ کام کرے جو سراسر ایمان کے منافی ہو اگر ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کا دماغ ماؤف ہے اور وہ پاگل ہے یا وہ آگ کے خواص و نتائج سے ابھی واقف نہیں ہے جیسے بچہ۔ اگر ایک آدمی کا دماغ بالکل صحیح ہے اور آگ کے خواص و نتائج سے بھی آگاہ ہے تو وہ یقیناً آگ میں ہاتھ ڈالنے سے احتراز کرے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص مومن ہے یعنی وہ علم و یقین کی روشنی رکھتا ہے اور ساتھ ہی افعالِ بد کے مہلک نتائج سے بھی بخوبی واقف ہے تو وہ کبھی جان بوجھ کر خود کو ہلاکت میں نہیں ڈال سکتا لیکن اگر کوئی شخص جو خود کو مومن کہتا ہے، برے افعال کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں یا تو وہ علم نہیں رکھتا اور اعمال کے نتائج و عواقب سے بالکل بے خبر ہے، یا نتائج کا علم تو رکھتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اسے ان پر یقین نہیں ہے۔ علاوہ بریں خواہشات نفسانی کی پیروی اور برے اعمال کی کثرت نے اس کے قلب و دماغ کو تاریک بنا رکھا ہے اور وہ شب بیاباں کے مسافر کی طرح تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

ایمان کامل کے ساتھ فجور و فواحش کا اجتماع ناممکن ہے جیسے روشنی کے ساتھ تاریکی آگ کے ساتھ پانی اور خوشبو کے ساتھ بدبو وغیرہ۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص کا ایمان یعنی علم و یقین اس درجے کا نہیں ہوتا اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ کمیٔ علم یا بے خبری میں اور یا کبھی خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر ایک مومن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو ایمان کے منافی ہو۔ اس امکانی خطا پر قرآن مجید کی چند آیتوں سے بخوبی روشنی پڑتی ہے مثلاً ایک جگہ آیا ہے:۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ: ۱۰۲)

اور کچھ دوسرے لوگ جنہوں نے اپنی خطاؤں کو تسلیم کرلیا ہے اور جن کے اعمال مخلوط ہیں یعنی کچھ اچھے اور کچھ برے عین ممکن ہے کہ اللہ ان کے حال پر متوجہ ہو (یعنی ان کی توبہ قبول کرے) بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

دوسری جگہ آیا ہے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ (حجرات:۹)

اور اگر مومنوں کے دو گروہ باہم لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مومن سے گناہ کا صدور ممکن ہے لیکن گناہ کی یہ حالت دائمی نہیں ہوتی بلکہ جیسے ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اس کی زبان پر کلماتِ استغفار جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کا طرزِ عمل عادی مجرموں جیسا نہیں ہوتا جو دیدہ و دانستہ مسلسل جرم کا ارتکاب کرتے جاتے ہیں اور کبھی ان افعال شنیعہ پر نادم تک نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف ایک مومن کی صفت قرآن نے یہ بتائی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۵)

اور وہ لوگ کہ جب ان سے کوئی برا فعل سرزد ہو جاتا ہے یا وہ اپنے نفس پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو فی الفور اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشنے والا ہے؟ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں (یعنی جب ان کو خطا کا احساس ہو جاتا ہے) تو پھر دیدہ و دانستہ اس پر اڑے نہیں رہتے۔

توبہ و استغفار

ایمان علم و یقین کا نام ہے اور گناہ جہالت کا۔ جس وقت ایک مومن گناہ کا ارتکاب

Marfat.com

کرتا ہے۔ علم کی یہ روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور اس کی ایمانی کیفیت بدل جاتی ہے۔ لیکن جس گھڑی اسے اپنی خطا کا احساس ہوتا ہے وہ اپنے فعل پر نادم و پشیمان ہوتا ہے، اللہ سے توبہ و استغفار کرتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اب دیدہ و دانستہ اس خطا کا ارتکاب نہیں کرے گا اور اس طرح اس کی ایمانی کیفیت لوٹ آتی ہے۔ ندامت اور توبہ و استغفار اس بات کی علامت ہے کہ مومن حالت جہل سے نکل کر حالت علم میں آگیا ہے اور یہی ایمان ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زنا کرنے والا اس حال میں زنا نہیں کرتا کہ وہ مومن ہو اور چور اس حالت میں چوری نہیں کرتا کہ وہ مومن ہو، لیکن توبہ پیش کی جانے والی چیز ہے۔"

اس باب میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے بھی روایت ہے نیز حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر مثل سائبان کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ یہ فعل کر چکتا ہے (اور اس پر پشیمان ہو کر توبہ کرتا ہے) تو ایمان اس کے پاس لوٹ آتا ہے۔"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد ارتکاب گناہ ممکن ہے لیکن جو چیز گناہ کے اثر کو زائل کر دیتی ہے وہ مومن کا توبہ و استغفار اور اصلاح حال کا جذبہ ہے۔ مومن گناہ کر کے خدا کی رحمت سے دور اور اس کے عذاب سے قریب ہو جاتا ہے لیکن توبہ و استغفار سے وہ خدا کی رحمت سے قریب اور اس کی مغفرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جو شخص گناہ کرتا ہے لیکن توبہ و استغفار نہیں کرتا اور اسی حالتِ گناہ میں بغیر توبہ و استغفار کے مرتا ہے تو وہ عذاب جہنم کا سزاوار ہے۔ اللہ کی رحمت و مغفرت تو ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو گناہ کے بعد فی الفور توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اصلاح اعمال کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے یہی بات معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

---

[1] ترمذی، ابواب الایمان۔

Marfat.com

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (انعام: ۵۴)

تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم ٹھہرالیا ہے کہ تم میں سے جس شخص نے بھی نادانی میں کوئی خطا کی پھر اس کے بعد (اللہ سے) توبہ کی اور اپنے عمل کی اصلاح کی تو وہ یقیناً اس کو معاف کردے گا کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (نساء: ۱۴۵، ۱۴۶)

بے شک منافقین آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے اور وہ کسی کو اپنا حامی و ناصر نہ پاسکیں گے۔ مگر ہاں وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اپنے عمل کی اصلاح کی اور اللہ سے اپنے تعلق کو مضبوط کرلیا اور اطاعت کو اسی کے لیے خاص کرلیا' ایسے لوگوں کا شمار مومنوں کے ساتھ ہوگا اور عنقریب اللہ مومنوں کو اجرِ عظیم سے نوازے گا۔

ان آیات سے واضح ہوگیا کہ توبہ واستغفار سے مومن کا ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے لیکن توبہ واستغفار صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ گناہ کے ارتکاب کے بعد بس اظہارِ شرمندگی کردیا جائے اور اللہ سے معافی مانگ لی جائے۔ اصل توبہ واستغفار جیسا کہ مذکورہ آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ بندہ ارتکابِ گناہ کے بعد اپنے فعل پر نادم ہو، خدا کے آگے کامل نیاز وبندگی کے ساتھ سر جھکا کر اپنی خطا کی معافی چاہے، جو کچھ ماضی میں ہوچکا ہے اس کی تلافی کی حتی المقدور کوشش کرے اور آئندہ اس کو نہ کرنے کا مصمم ارادہ کرے، نیز خدا کے تمام احکام وہدایات پر خلوصِ دل سے عمل کرے، غرض یہ کہ اپنے ہر فعل سے ثابت کردے کہ وہ پہلے خطاکار ضرور تھا لیکن اب خدا کا مخلص اور نیکوکار بندہ بن چکا ہے۔

توبہ واستغفار کے لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد کرلی جائے، کون

Marfat.com

جاتا ہے کہ زندگی کا چراغ کب گل ہو جائے۔ توبہ واستغفار کے بعد اصلاح عمل ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آدمی اجل معین کی آمد سے بہت پہلے تائب ہو کر اعمال حسنہ کے ذریعہ تلافی مافات کر لے۔ موت کے وقت کی توبہ قبول نہیں ہوتی یعنی آدمی زندگی بھر گناہ کرتا رہے اور کبھی توبہ واستغفار نہ کرے لیکن موت کو پاس کھڑی دیکھے تو جھٹ توبہ واستغفار کرنے لگے۔ ایسی توبہ خدا کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ سچا مومن تو وہ ہے جو ارتکاب گناہ کے بعد فوراً توبہ واستغفار کے جملہ مراحل طے کر لیتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (نساء: ۱۷، ۱۸)

اللہ کے نزدیک صرف انہی لوگوں کی توبہ قابل قبول ہے جو نادانی میں خطا کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برائیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ لگتا ہے تو کہتا ہے "اب میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں"۔ اور اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی جن کی موت حالت کفر میں واقع ہوتی ہے۔ ہم نے ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک توبہ گزار بندہ کی توبہ وانابت سے جتنا خوش ہوتا ہے اس کا کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا۔ ادھر اشکوں کے جلو میں ایک بندۂ مومن کا دست استغفار اٹھتا ہے اور ادھر رحمت ومغفرت کی آغوش اس کے لیے وا ہو جاتی ہے: ؎

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے　　قطرے جو گر پڑے عرق انفعال کے

ایک توبہ گزار بندہ کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو بیابان میں اپنی راہ بھول گیا ہو اور کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکنے اور تکلیفیں اٹھانے کے بعد صحیح راہ پر گام زن ہو جائے یقیناً

Marfat.com

وہ اس راہ یابی پر دل میں نہایت مسرور ہوگا یہی کیفیت ایک بندۂ تائب کی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جب ایک خطا کار بندہ اپنے گناہوں سے تائب ہو کر برّ و تقویٰ کی راہ اختیار کرلیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی بات کو تمثیلات کے پیرایہ میں یوں بیان فرمایا ہے:

"کون ایسا ہے جس کے پاس سو بھیڑیں ہوں اور ان میں سے ایک کھو جائے تو ننانوے کو بیاباں میں چھوڑ کر اس کھوئی ہوئی کو جب تک مل نہ جائے ڈھونڈتا نہ رہے پھر جب مل جاتی ہے تو وہ خوش ہو کر اسے کندھے پر اٹھا لیتا ہے ٥ اور گھر پہنچ کر دوستوں اور پڑوسیوں کو بلاتا اور کہتا ہے، میرے ساتھ خوشی کرو کیوں کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مل گئی ہے ٥ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اسی طرح ننانوے راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث آسمان پر زیادہ خوشی ہوگی ٥" یا کون ایسی عورت ہے جس کے پاس دس درہم ہوں اور ایک کھو جائے تو وہ چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو نہ دے اور جب تک مل نہ جائے کوشش سے ڈھونڈتی نہ رہے ٥ اور جب مل جائے تو اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو بلا کر نہ کہے کہ میرے ساتھ خوشی کرو کیوں کہ میرا کھویا ہوا درہم مل گیا ٥ میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی طرح ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث خدا کے فرشتوں کے سامنے خوشی ہوتی ہے۔" آپ نے مزید فرمایا:۔

"کسی شخص کے دو بیٹے تھے ٥ ان میں چھوٹے نے باپ سے کہا، اے باپ مال کا جو حصہ مجھ کو پہنچتا ہے مجھے دیدے۔ اس نے اپنا مال و متاع بانٹ دیا ٥ اور بہت دن نہ گزرے کہ چھوٹا بیٹا اپنا سب کچھ جمع کر کے دور دراز ملک کو روانہ ہوا اور وہاں اپنا مال بدچلنی میں اڑا دیا ٥ اور جب خرچ کر چکا تو اس ملک میں سخت کال پڑا اور وہ محتاج ہونے لگا ٥

Marfat.com

پھر اس ملک کے ایک باشندہ کے یہاں جا پڑا۔ اس نے اس کو اپنے کھیتوں میں سور چرانے بھیجا ٥ اور اسے آرزو تھی کہ جو پھلیاں سور کھاتے ہیں انہی سے اپنا پیٹ بھر لے مگر کوئی اسے نہ دیتا تھا ٥ پھر اس نے ہوش میں آکر کہا: میرے باپ کے کتنے ہی مزدوروں کو افراط کے ساتھ روٹی ملتی ہے اور میں یہاں بھوکا مر رہا ہوں ٥ میں اٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا " اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا ٥ اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں ٥ مجھے اپنے مزدوروں جیسا کرلے "٥ پس وہ اٹھ کر اپنے باپ کے پاس چلا۔ وہ ابھی دور ہی تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے باپ کو اس پر ترس آیا اور دوڑ کر اس کو گلے لگا لیا اور بوسے لیے ٥ بیٹے نے اس سے کہا " اے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہوا۔ اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں ٥ ...... باپ نے اپنے نوکروں سے کہا " اچھے سے اچھا جامہ نکال کر اسے پہناؤ اور اس کے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی پہناؤ ٥ اور پلے ہوئے بچھڑے کو لاکر ذبح کرو تاکہ ہم خوشی منائیں ٥ کیوں کہ میرا یہ بیٹا مردہ تھا اب زندہ ہو گیا ہے، کھو گیا تھا اب مل گیا ہے۔ پس وہ خوشی منانے لگے ٥ لیکن اس کا بڑا بیٹا کھیت میں تھا۔ جب وہ آکر گھر کے نزدیک پہنچا تو گانے بجانے اور ناچنے کی آواز سنی ٥ اور ایک نوکر کو بلا کر دریافت کرنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ٥ اس نے اس سے کہا، تیرا بھائی آگیا ہے اور تیرے باپ نے پلا ہوا بچھڑا ذبح کر دیا ہے کیونکہ اسے بھلا چنگا پایا ٥ وہ غصہ ہوا اور اندر جانا نہ چاہا مگر اس کا باپ باہر جا کر اسے منانے لگا ٥ اس نے باپ سے جواب میں کہا " دیکھ میں اتنے برسوں سے تیری خدمت کرتا ہوں اور کبھی تیری حکم عدولی نہیں کی مگر تو نے مجھے کبھی ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی مناتا ٥ لیکن جب تیرا یہ بیٹا آیا جس نے تیرا مال و

Marfat.com

متاع کسبیوں میں اڑا دیا تو تو نے اس کے لیے پلا ہوا بچھڑا ذبح کرایا۔ اس نے اس سے کہا بیٹا! تو، تو ہمیشہ میرے پاس ہے اور جو کچھ میرا ہے وہ تیرا ہی ہے۔ لیکن خوشی منانا اور شادماں ہونا مناسب تھا کیوں کہ تیرا یہ بھائی مردہ تھا اب زندہ ہوا، کھویا ہوا تھا اب ملا ہے۔"[1]

گناہ کبیرہ اور توبہ و استغفار

کیا توبہ و استغفار سے گناہ کبیرہ بھی معاف ہو سکتے ہیں؟ قرآن پاک سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار سے انسان کے گناہ کبیرہ بھی معاف ہو سکتے ہیں بشرطیکہ بندہ آیندہ خدا کی کامل اطاعت و بندگی کا ثبوت دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ (زمر: ۵۳، ۵۴)

(اے محمد) میرے ان بندوں سے کہہ دو جنھوں نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے، کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا، بلاشبہ وہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (اس کی اس شان رحمت کا تقاضا ہے کہ) تم اس کی طرف پلٹ آؤ اور سر اطاعت جھکا دو قبل اس کے کہ تم کو عذاب آدبوچے اور پھر تمہیں کہیں سے کوئی مدد نہ مل سکے۔

اس آیت میں "اَنِیْبُوْا" کے بعد "اسلموا" کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ توبہ کے بعد خدا کی کامل اطاعت اور فرماں برداری ضروری ہے اور یہی چیز اسے عذاب خداوندی سے نجات دے سکتی ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

---

[1] لوقا باب ۱۵: ۳ تا ۳۲

Marfat.com

الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿﴾ (مائدہ: ۳۹، ۴۰)

جس نے ظلم (گناہ) کے بعد توبہ کی اور اپنے اعمال کو درست کر لیا تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ بیشک اللہ مغفرت والا اور رحمت والا ہے۔ کیا تم کو خبر نہیں کہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہت اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا :۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ﴿﴾
(قصص: ۶۷)

پس جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور اچھا عمل کیا تو امید ہے کہ ایسے لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اگر ایک بندہ توبہ و استغفار کر لیتا ہے اور اعمال صالحہ کے ذریعہ گزشتہ کی تلافی بھی کر لیتا ہے تو وہ یقیناً رحمت خداوندی کا مستحق ہوگا۔ فی الواقع توبہ و استغفار وہ نسخۂ کیمیا ہے جو ہر کھوٹے کو کھرا اور مسِ خام کو کندن بنا دیتا ہے۔ توبہ و استغفار ہمارے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی سنت اور اعراض و استکبار ابلیس ملعون کا شیوہ ہے۔ جو سنت آدم کی پیروی کرے گا وہ خدا کی رحمت و مغفرت کا سزاوار ہوگا اور جو ابلیس کا طرزِ عمل اختیار کرے گا وہ ملعون و نامراد ٹھہرے گا۔ پس جو شخص اس دنیا میں توبہ و استغفار نہیں کرتا بلکہ تمرّد و سرکشی کا رویّہ اختیار کرتا ہے اور اسی حالت میں اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے تو اس کے لیے روزِ قیامت، خدا کی رحمت و مغفرت کا ہر دروازہ بند ہوگا کیوں کہ اس نے توبہ و استغفار کے ذریعہ دنیا میں کلیدِ مغفرت کو حاصل نہ کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿﴾ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ

Marfat.com

لَھُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَھُمْ ۔ لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ ۔ (منافقون: ۵،۶)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لیے دعائے مغفرت کرے تو تم دیکھتے ہو کہ وہ غرور و استکبار میں اپنے سروں کو پھیر کر بے رخی برتتے ہیں خواہ تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اللہ انھیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔

یاد رکھیے کہ توبہ اور استغفار سے گناہ کبیرہ کا مرتکب صرف روز آخرت کی سزا سے بچ سکتا ہے، لیکن اس دنیا میں اگر اسلامی حکومت قائم ہے اور گناہ ظاہر ہو کر سماج میں ایک معلوم واقعہ بن گیا ہے، تو توبہ و استغفار سے کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب کی سزا منسوخ نہیں ہو سکتی ہے۔ سماج کے استحکام، تمدن کی بقا، اخلاق کی پاکیزگی اور فکر و نظر کی طہارت کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین کے مطابق اس کو سزا ملے۔ اس پر مفصل گفتگو آپ کو اگلے صفحات میں ملے گی۔

گناہ کبیرہ اور خوارج و معتزلہ کا نقطۂ نظر

اس سلسلے میں معتزلہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو مطلق مومن ہوتا ہے اور نہ ہی مطلق کافر، بلکہ درمیانی حالت میں ہوتا ہے۔ علی الحسن البصری (متوفی ۱۱۰ھ) سے کسی نے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا:

انا لا اقول إن صاحب الکبیرۃ مومن مطلقا ولا کافر مطلقا، بل ھو فی منزلۃ المنزلتین: لا مومن ولا کافر[1]

میں گناہ کبیرہ کے مرتکب کو نہ تو مطلقاً مومن کہوں گا اور نہ ہی مطلقاً کافر، بلکہ وہ ان دونوں کی درمیانی منزل میں ہوتا ہے، نہ مومن نہ کافر۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ اسی درمیانی حالت میں مرجائے تو عذاب جہنم کا سزاوار ہوگا، اور یہ سزا دائمی ہوگی۔

---

[1] الملل والنحل ج ۱ ص ۴۸

Marfat.com

معتزلہ کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ اولاً تو یہ عدل کے منافی ہے کہ ایک گناہ کی پاداش میں مرتکبِ گناہ کو عذاب جہنم کی دائمی سزا ملے۔ قرآن نے یہ بات واضح لفظوں میں بیان کر دی ہے کہ مومن کے اعمال حسنہ کی جزا تو دو چند اور سہ چند ہوگی، لیکن گنہگار کو صرف بقدرِ گناہ سزا ملے گی گویا اگر اس سے زیادہ سزا دی گئی تو یہ صریح ظلم ہوگا، اور خدائے عادل کی ذات ظلم و حق تلفی سے پاک ہے، وہ خود فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ (مومن: ۱۷)

آج کے دن ہر متنفس کو اس کے کیے کی پوری پوری جزا ملے گی۔ آج کوئی ظلم نہ ہوگا بیشک اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔

ثانیاً یہ طے کرنا کہ کون جہنم کی سزا کا مستحق ہے اور کون جنت کا سزاوار ہے، کس کو خلودِ نار کی سزا ملے گی اور کون عذاب جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد خدا کی رحمت و مغفرت سے سرفراز ہوگا؟ ان باتوں کے متعلق کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود سے فیصلہ کرتا پھرے، کیوں کہ عذاب اور مغفرت کا تمام اختیار صرف خدائے علیم و خبیر کے ہاتھ میں ہے:

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (بقرہ: ۲۸۴)

وہ جس کو چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خدا عادل و رحیم ہے اور علیم و حکیم بھی، وہ روز آخرت خود فیصلہ کرے گا کہ آج کون سزا کا مستحق ہے، کون انعام کا اور کون پروانۂ مغفرت کا سزاوار ہے۔ سزا، انعام اور مغفرت تینوں امور کا فیصلہ کامل عدل کے ساتھ ہوگا۔ کسی انسان کو خواہ وہ کسی مرتبہ و مقام کا مالک ہو اس دنیا میں سزا، انعام اور مغفرت کا پروانہ تقسیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ اسلامی تاریخ کے تقریباً ہر دور میں ایسے علماء موجود رہے ہیں جنھوں نے کتنے ہی خداترس اور نیکوکار انسانوں کے خلاف کفر کے فتاوے صادر کیے ہیں۔ یہ کام انھوں نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

گناہ کبیرہ کے باب میں خوارج کا نقطۂ نظر بھی صریحاً نقطۂ عدل سے متجاوز اور کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معصیت کا مرتکب دائرہ ایمان سے نکل کر دائرۂ کفر میں آجاتا ہے، اور وہ دوسرے کافروں کی طرح دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہوگا۔ اگر خوارج کے اس خیال کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں توبہ واستغفار کے جو الفاظ کثرت سے آئے ہیں وہ بے معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ توبہ واستغفار ارتکاب گناہ کے بعد ہی کی چیز ہے۔ اگر کسی گناہ کے ارتکاب سے مومن کافر ہوجاتا ہے اور دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہے تو توبہ واستغفار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات عقلاً بھی غلط ہے اور رحمتِ خداوندی کے بھی سراسر خلاف ہے۔

درحقیقت ایمان کے بعد ارتکاب گناہ ممکن ہے لیکن گناہ کے اثرات کو جو چیز زائل کردیتی ہے وہ مومن کا توبہ واستغفار اور اصلاح حال کا جذبہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم متعدد قرآنی آیتیں پچھلے صفحات میں نقل کرچکے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (اعراف: ۱۵۳)

اور وہ لوگ جنھوں نے برائیاں کیں پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے تو بیشک اللہ اس (توبہ و ایمان) کے بعد (ہر برائی سے) درگزر کرنے والا اور رحم

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) کچھ اس انداز میں کیا ہے جیسے وہ خود ہر خطا ولغزش سے مامون ہوں۔ ان تکفیری مشاغل کے پس پردہ دراصل ان کی مذہبی انانیت، خودپرستی وخودنمائی، بغض وحسد، معاصرانہ چشمک، روایت پرستی، کورانہ تقلید اور سب سے بڑھ کر دنیا پرستی جسے قرآن نے "اخلد الی الارض" سے تعبیر کیا ہے، کارفرما ملتی ہے۔ کاش یہ علماء دیوبند کی طرح پروانۂ عذاب وگمرہی تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے کہ ان کے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ اس بات کو نہ بھولیں کہ انسان کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، کون آج کیا ہے اور کل کیا ہوجائے گا وہ نہیں جان سکتے۔ بڑے سے بڑا فاجر و بدکار، متقی اور نیکوکار بن سکتا ہے، اور زہد و ورع کا حامل ضلالت و فسق میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

کرنے والا ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص گناہ کا ارتکاب کرے اور کرتا ہی چلا جائے، نہ تو اپنے گناہ پر نادم ہو کر توبہ استغفار کرے، اور نہ ہی حدود اللہ کی خلاف ورزی کی کوئی سزا اسے اس دنیا میں ملے، اور اسی حالت فسق میں وہ مر جائے تو ایسا شخص روز آخرت اپنے اعمال بد کی پاداش میں یقیناً سزا کا مستحق ہوگا، لیکن اس سزا کی نوعیت کیا ہوگی، اور مدت سزا کیا ہوگی؟ ہم اس سلسلے میں کسی قیاس و گمان کی بنا پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

گناہ اور عذاب کے بارہ میں معتزلہ اور خوارج کی طرح ایک تیسرا فرقہ مرجیہ کا بھی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ اور ایمان دو علیحدہ چیزیں ہیں کسی گناہ کا مرتکب دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا خواہ وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، اور کوئی گنہگار مومن جہنم میں نہیں جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ سراسر قرآنی تعلیمات کے منافی ہے، اور یہ خدا کے عادل ہونے کی نفی بھی کرتا ہے حیرت ہے کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے یہ عقیدہ مسلمانوں میں کیسے راہ پاگیا، اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں باقی بھی ہے۔ خود قرآن پاک اس عقیدۂ باطل کی تردید ان الفاظ میں کرتا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (نساء: ۱۲۳، ۱۲۴)

نہ تو تمہاری آرزوؤں سے، اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں سے کام چلنے والا ہے۔ جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، اور وہ اللہ کے مقابلے میں کوئی حامی و ناصر نہ پا سکے گا، اور مرد ہو یا عورت جو بھی اچھے کام کرے گا اور دولت ایمان سے بہرہ ور بھی ہوگا، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرہ برابر بھی کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

یہودیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ جہنم کی آگ ان پر حرام ہے، اور اگر جہنم میں گئے

Marfat.com

بھی تو بس چند دنوں کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خوش فہمی کو دور کرنے کے لیے فرمایا:۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗــــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ: ۸۰،۸۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ آگ تو ہم کو بس چند دنوں کے لیے ہی چھوئے گی۔ کہہ دو کہ کیا اس بات کے لیے تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ اس عہد کی خلاف ورزی نہ کرے گا، یا تم اللہ کے سلسلے میں ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تم کو مطلق علم نہیں ہے۔ آخر تم کو دوزخ کی آگ کیوں نہیں چھوئے گی؟ جو بھی برائی کا سودا کریگا اور اس کی خطائیں اس کو (سر سے پیر تک) ڈھانپ لیں گی، وہ دوزخی ہے اور اس میں ہمیشہ رہے گا۔

عمل غیر صالح کی سزا

تورات میں اعمال صالحہ کی جزا کی طرح جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں آپ کو بتا چکے ہیں اعمال بد کی جو سزائیں بیان کی گئیں ہیں وہ دنیوی نوعیت کی ہیں، اس کے برخلاف انجیل میں بیان کردہ سزائیں خالص اُخروی نوعیت کی ہیں، لیکن قرآن میں اعمال بد کی جو سزائیں بیان کی گئی ہیں وہ دنیوی اور اُخروی دونوں طرح کی ہیں، اور دیگر امور کی طرح اس باب میں بھی قرآنی تعلیم نقطۂ عدل پر قائم ہے، اور انسانی عقل و فہم کے لیے تسلی بخش اور حیات آفریں ہے جیسا کہ اگلے صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

دنیوی سزا

انسان کے برے اعمال کی کچھ سزائیں تو اسے اسی دنیا میں مل جاتی ہیں مثلاً تنگیٔ معاش

Marfat.com

ذلت و رسوائی، مرعوبیت و محکومیت، اضطراب و غم، خوف جان و مال اور امراض و بلائیں وغیرہ۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید کی یہ آیت واضح اشارہ کرتی ہے:۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (زمر: ۲۶)

پس اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا اور سخت ہے، کاش یہ جانتے۔

دنیوی سزائیں جو انسان کو برے اعمال کے صلے میں ملتی ہیں وہ دراصل اس کے برے اعمال کے لوازم و نتائج ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں صرف اس لیے ظاہر کر دیتا ہے تاکہ انسان خواب غفلت سے بیدار ہو کر تضرّع اور حق شناسی کی راہ اختیار کرے، اور آخرت کے زیادہ دردناک عذاب سے نجات کا سامان کر لے۔ اس اہم حقیقت کی طرف قرآن مجید میں متعدّد جگہوں پر اشارے کیے گئے ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ (شوریٰ: ۳۰)

تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے، اور وہ تمہاری بیشتر خطاؤں سے تو صرف نظر کر جاتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝ (اعراف: ۹۴)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو یہ ضرور ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگی اور تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ تضرّع کی راہ اختیار کریں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں ایک انسان کو جن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑتا ہے یا تو وہ خود اس کے اپنے افعال بد کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور یا اس سے مقصود بندے کی آزمائش ہوتی ہے۔ فرمایا:۔

Marfat.com

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

اور ہم تم کو خوف، فاقہ، مالوں، جانوں اور پھلوں کے نقصانات میں سے کسی نہ کسی چیز سے ضرور آزمائیں گے۔ اور آپ ایسے صابرین کو بشارت دے دیجئے (جن کا حال یہ ہے) کہ جب اُن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم (اور ہماری ہر چیز) خدا کی ملک ہے، اور (ایک دن) ہم کو اس کے پاس جانا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی برکات اور رحمت کا نزول ہوتا ہے، اور یہی لوگ ہیں جن کی راہِ فکر و عمل درست ہے۔

اس دنیا میں بُرے اعمال کی ایک سزا وہ بھی ہے جو اسلامی حکومت کے تحت اس کے تعزیری قوانین کی رو سے گنہگاروں اور مجرموں کو دی جاتی ہے۔ یہ سزا پاکر ایک گنہگار مومن روزِ آخرت کی بدترین سزا سے بچ جاتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے کیے ہوئے گناہ پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے بصدقِ دل معافی مانگ لے، ایسی شکل میں دنیوی سزا کے بعد یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ بے پایاں سے اس کے قصور معاف کر دے گا، رہے عادی مجرمین تو ان کے لیے دنیا کی سزا آخرت کی سزا کا ایک حصّہ ہے، روزِ آخرت بھی وہ سزا سے بچ نہیں سکیں گے:

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (البقرہ: ۱۱۴)

ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بھی عذابِ عظیم تیار ہے۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اشرار و مجرمین عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں، اور انھیں ہر طرح کی دنیوی عزت و کامرانی حاصل ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بہت سے نادان اور حقیقتِ حال سے بے خبر انسان اسے اللہ کا لطف و کرم گمان کر بیٹھتے ہیں، اور اشرار بھی یہی سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی غلط فہمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی بندۂ خدا کو خوش حالی اور مال و زر کی فراوانی حاصل ہے، اور وہ خدا کا مطیع و فرماں بردار بھی ہے تو یہ بیشک اللہ تعالیٰ کا انعام و اکرام ہے

Marfat.com

جیسا کہ ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اعراف: ۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور خدا ترسی کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (خوش حالی) کے دروازے کھول دیتے۔

لیکن اگر کوئی بندہ، خدا کی نافرمانی اور سرکشی کے باوجود خوش حال ہے تو یہ خدا کا انعام نہیں بلکہ اس کا عذاب ہے، ارشاد ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ (انعام: ۴۴)

جو کچھ نصیحت انھیں کی گئی تھی جب انھوں نے اسے بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوش حالی کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان دنیوی نعمتوں میں جو انھیں عطا کی گئی تھیں، مست و مگن تھے تو اچانک ہم نے انھیں پکڑ لیا، اور اب حال یہ تھا کہ وہ سراپا یاس ہی یاس تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجرموں اور بدکاروں کو جو خوش حالی ملتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے، اور ایک نہ ایک دن اللہ انھیں ضرور مبتلائے عذاب کرتا ہے، اور اگر کبھی چھوڑ دیتا ہے تو یہ بھی کم عذاب نہیں کہ وہ اس دنیا سے اس حال میں جاتے ہیں کہ انھیں توبہ و استغفار کی بھی توفیق نہیں ملتی۔

اسلامی سزاؤں کی حقیقت

اسلام کے تعزیری قوانین کی رو سے مجرمین کو جو سزائیں ملتی ہیں ان پر مغرب سے مرعوب بعض ارباب علم و خرد اعتراض کرتے ہیں کہ یہ سزائیں ظالمانہ ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ ان کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے؟

جرائم کے انسداد یا دوسرے لفظوں میں نفس انسانی کی تہذیب صرف دو طریقوں

سے ممکن ہے، ایک تخویف وتعذیب اور دوسرے ترغیب وتحریص۔ ایک بچے کی تعلیم وتربیت سے لے کر ایک خاندان کی بقا اور ایک ملک کے قیام وانتظام، اور ایک اچھے انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لیے یہی دو عنصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں جو تعزیری قوانین نافذ العمل ہیں ان میں آپ کو یہی دو عنصر روح رواں کی حیثیت سے ملیں گے، اور اس میں بھی تخویف وتعذیب کا عنصر غالب ہوگا۔ درحقیقت کسی ملک کا انتظام وانصرام اور تہذیب وتمدن کی بقا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس ملک کے باشندوں کے اندر یہ قوی احساس نہ پایا جائے کہ ان کا ہر وہ فعل قابل مواخذہ اور لائق تعزیر ہے جو فرد یا سماج کے حقوق پر دست اندازی اور ملکی انتظام میں خلل اندازی کا سبب بنے گا۔ عدالتیں، جیل اور پولیس فورس کے قیام کی غرض اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے کہ سماج کے جن افراد کے اندر مجرمانہ داعیات موجود ہوں ان کو کنٹرول کیا جائے۔

آج مغرب کے جن ملکوں میں تخویف کے عنصر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی جرائم کی سزائیں تخفیف کردی گئی ہے وہاں شرح جرائم بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، اور اب حالت یہ ہے کہ کثرت کے ساتھ شراب نوشی، زناکاری، چوری، رہزنی اور قتل جیسے جرائم ان کے سماج میں عام ہو گئے ہیں، اور یہی اخلاقی امراض ایک دن مغربی تہذیب وتمدن کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ کسی بھی سماجی نظام میں تخویف و انذار کے عنصر کو نکال دینے یا اسے غیر مؤثر بنا دینے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ خبیث النفس انسانوں کی خباثت ودنائت ابھر کر معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لے گی اور شریف النفس انسان سماج میں بالکل دب کر رہ جائیں گے۔

کسی انسانی سماج میں توازن واعتدال صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے جب اس میں ترغیب کے ساتھ تخویف کا عنصر بھی حسب ضرورت موجود ہو۔ اسلامی نظام عدل انہی دو عناصر کے اعتدال پر قائم ہے۔ ایک طرف وہ سماج میں نیکیوں کے فروغ کے لیے کوششیں کرتا ہے تاکہ جو لوگ صالح طبیعت کے ہوں وہ شر وفساد سے محفوظ رہ کر نیکی میں اور پختہ تر ہو جائیں، اور دوسری طرف وہ برائیوں کے سدباب کے لیے سخت تری

تدابیر اختیار کرتا ہے تاکہ جو انسانی طبائع غیر صالح ہوں وہ سخت تدابیر کے نتیجے میں غلط روی سے باز آجائیں۔

اس سلسلے میں اسلام سب سے پہلے دلوں میں خدا کے علیم و خبیر ہونے اور روزِ آخرت اعمال کی جزا و سزا کے تصور کو راسخ کرتا ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ انسان کا ایک خالق و مالک ہے جو ہر جگہ اور ہر حالت میں اس کے ایک ایک فعل کی نگرانی کر رہا ہے، اور ایک دن جس کو مذہب کی زبان میں آخرت یا یوم الدین کہا جاتا ہے، وہ عدل کامل کے ساتھ ہر انسان کے اعمال کا محاسبہ کرے گا، اور اس کے اچھے اور برے کاموں کی جزا و سزا دے گا۔ اس دن کسی کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ اعمال کے محاسبہ اور اس کے نتائج سے بچ جائے خواہ وہ اس دنیا میں کسی بھی مرتبہ و مقام کا مالک رہا ہو۔

محاسبۂ اعمال کے اس تصور کو دلوں میں بٹھا دینے کے بعد وہ ان تمام اسباب و محرکات کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک انسان کو برائیوں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسا نظامِ اخلاق و تربیت مرتب کرتا ہے جو انسان کے اندر صالح جذبات و احساسات پیدا کرے، برے جذبات کو دبائے اور اس کے قلب و دماغ میں برائیوں سے ایک فطری تنفر پیدا کر دے۔ ان تمام تدابیر کے بعد ہی وہ سزاؤں کو نافذ کرتا ہے، کیوں کہ اصلاح و تربیت کی جملہ تدابیر کے باوجود اگر کوئی شخص فعل گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے جسم کا ایک ایسا سڑا ہوا عضو ہے جس کو کاٹ کر پھینک دینا باقی جسم کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اس متعفن عضو کو کاٹ کر علٰحدہ کر دینا کوئی ظالمانہ فعل نہ ہوگا بلکہ ظلم یہ ہوگا کہ اس متعفن عضو کو باقی رکھا جائے اور وہ دوسرے اعضا میں بھی تعفن کے جراثیم پھیلاتا رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان کا ایک جرم کسی سبب سے پوشیدہ رہ جائے یا اس سے لوگ دیدہ و دانستہ صرف نظر کر لیں تو نہ صرف اس کے اندر دوسرے جرائم کے ارتکاب کی تحریک پیدا ہوتی ہے بلکہ سماج کے دوسرے بہت سے نفس پرست اور مفسد انسان بھی جرائم کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ سماج میں گناہ کا مرض پھیل کر

Marfat.com

متعدّی بن جاتا ہے۔ اسلامی نظام کا استحکام اور اس کے اخلاقی اصولوں کا اقتضاء ہے کہ برائیوں کو ہر ممکن طریقے سے معاشرے میں متعدّی بننے سے روکا جائے۔ اور اس کی ایک ہی شکل ہے کہ جرائم کی سزائیں سخت ترین رکھی جائیں تاکہ ہر شخص ان سے عبرت کا درس لے اور جرائم کے ارتکاب سے باز آجائے جیسا کہ زنا کی سزا میں قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (نور: ۲)

زانیہ عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑوں کی سزا دو، اور اللہ کے اس قانون کو نافذ کرنے میں ذرا بھی نرمی کا مظاہرہ نہ کرو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہو۔ اور جب زانیہ عورت اور زانی مرد کو سزا دو تو (عبرت پزیری کے لیے) مومنوں کا ایک گروہ موقع پر ضرور موجود رہے۔

آپ اس پس منظر میں اسلامی سزاؤں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ دراصل نفس انسانی کے امراض کا ایک ناگزیر علاج ہیں۔ فی الواقع اسلام ایک قاتل کو قتل کی سزا دے کر ہزاروں معصوم انسانوں کی جانوں کو ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے، وہ ایک زانی اور زانیہ کو سنگسار کرکے ان گنت مردوں اور عورتوں کی عصمت و عفت کی حفاظت کا سامان مہیا کرتا ہے، وہ ایک چور کا ہاتھ کاٹ کر بے شمار افراد کو امن وچین کی نیند سونے اور بے خوف و خطر اپنے کاروباری مشاغل جاری رکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، وہ شراب نوشوں، بہتان طرازوں اور دوسرے مجرمین کو کوڑے مار کر کتنے ہی انسانوں کی عزت و ناموس کو پامال ہونے سے بچا لیتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کی ہر سزا مجرم کے لیے نہایت سخت و شدید ہے لیکن سماج کے شریف اور نیک سرشت انسانوں کے لیے سراپا رحمت و شفقت ہے۔

مجرمین کو سخت ترین سزائیں دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست میں خوف و ہراس کا ماحول پایا جاتا ہے، اور اس میں روزانہ لوگوں کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ دراصل اسلام ایک ایسا صالح معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں ارتکاب جرم

ایک مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ آپ عہد نبوی اور عہد خلافت پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس پورے عرصہ میں قطع ید، رجم اور قصاص وغیرہ کی جو سزائیں دی گئی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسلام کا نظام تربیت واخلاق اور اس کے تعزیری قوانین دونوں مل کر سماج سے جرائم کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیتے ہیں۔

اس واضح حقیقت کے باوجود مغرب کے نام نہاد ارباب علم ودانش اسلام کے تعزیری قوانین کو ظالمانہ اور غیر مہذبانہ کہتے ہیں، اور ان کی کورانہ تقلید میں کچھ تعلیم یافتہ خاندانی مسلمان بھی ان قوانین کو نشانۂ اعتراض اور ہدف ملامت بناتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام کے تصور جرم وسزا اور مغرب کے تصور جرم وسزا میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب کا تصور جرم وسزا یہ ہے کہ ارتکاب جرم سماجی حالات کے تابع ہے۔ سماج ہی ایک شخص کو مجرم بناتا ہے، اس لیے مجرم کو سزا دینے سے پہلے ضروری ہے کہ سماج کی اصلاح کی جائے اور ان تمام اسباب ومحرکات کو ختم کیا جائے جو کسی جرم کی علت بنتے ہیں۔ جب تک جرائم کے اسباب ومحرکات کا استیصال نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک کسی مجرم کو سخت سزا یعنی سزائے موت دینا ایک ظالمانہ فعل ہوگا۔

اس کے علاوہ مغرب کے نزدیک ظلم وزیادتی کا نام جرم وگناہ ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی فعل بھی جرم کے درجہ میں نہیں آتا مثلاً زنا بالتراضی اس کے یہاں کوئی جرم نہیں ہے، شراب نوشی اور قمار بازی بھی اس کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کی نظر میں ہر وہ انسانی فعل جرم وگناہ اور مستلزم سزا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے جرم وگناہ قرار دیا ہے خواہ وہ باہمی رضا ورغبت سے ہی کیوں نہ انجام پائے۔ چنانچہ اس کے نزدیک زنا بالتراضی بھی ایک قابل مواخذہ ولائق سزا جرم ہے جیسے زنا بالجبر، کیوں کہ زنا کی دونوں ہی شکلیں اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک صالح تمدن اور پاکیزہ انسانی معاشرہ کے لیے موجب ہلاکت ہیں۔

جہاں تک سزاؤں کے نفاذ سے پہلے سماج کی اصلاح وتہذیب کا معاملہ ہے، اسلام بھی اصولی حیثیت سے اس کا قائل ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے ایک روایت ہے جس میں وہ فرماتی ہیں :-

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصّل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اوّل شيئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدًا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدًا[1]

قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ ایک ایسی مفصّل سورہ ہے جس میں دوزخ وجنت کا ذکر ہے، یہاں تک کہ جب لوگ دائرہ اسلام میں مکمل طور پر آگئے تب حلال و حرام کے احکام اترے، اور اگر بالکل شروع ہی میں حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے، اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنے تعزیری قوانین کی تنفیذ، افراد معاشرہ کی ذہنی و اخلاقی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے تدریج کے ساتھ کرتا ہے، اور ان کے اطلاق میں احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں چوری کی سزا قطع ید (AMPUTATION OF HAND) ہے، لیکن وہ اس سزا کا نفاذ اسی وقت کرتا ہے جب اسلامی مملکت میں کوئی بے روزگار اور بھوکا اور ننگا نہیں رہ جاتا۔ وہ پہلے رزق کی ضمانت دیتا ہے اور پھر قطع ید کی سزا نافذ کرتا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چوری کی علت صرف بے روزگاری اور غربت و افلاس ہی نہیں ہے۔ ہر ملک میں چوری کے کتنے ہی ایسے واقعات مل جائیں گے جس میں چور کا تعلق خوش حال گھرانوں سے ہوتا ہے۔ کوئی بتائے کہ اس حالت میں علتِ سرقہ کیا ہے؟ کیا یہ اس کی بدترین خصلت کا ثبوت نہیں ہے؟ اور کیا ایسے مجرموں کے ساتھ بھی نرمی یا عفو و درگزر کا معاملہ کیا جا سکتا ہے؟ بالخصوص اس وقت جب معلوم ہو جائے کہ یہ عادی مجرم ہے۔ اسلام میں ایسا مجرم لینت اور عفو و درگزر کا مستحق نہیں ہے۔ ایسے مجرموں

---

[1] بخاری، باب تالیف القرآن

کے ساتھ عفوو درگزر کا معاملہ کرنا گویا دیدہ و دانستہ ارتکاب جرائم کو ہوا دینا ہے، اور یہ شریف اور امن پسند انسانوں کے ساتھ صریح ظلم ہے۔ اسلام عفوو درگزر کا مظاہرہ صرف اس حالت میں کرتا ہے جب یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ واقعۂ سرقہ کا سبب غربت و افلاس اور فقر و فاقہ ہے۔ اسلام ایسی حالت میں قطع ید کا حکم نہیں دیتا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں جب قحط پڑا تو آپ نے قطع ید کی سزا کو منسوخ کر دیا اور عملاً اس پر عمل بھی فرمایا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ اسلام سزا اور عفوو درگزر کے معاملے میں اعتدال و توسط کی راہ اختیار کرتا ہے اور تنفیذ سزا میں احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتا ہے۔

اسلام اپنے تعزیری قوانین کے نفاذ سے پہلے محض سماج سے جرائم کے خارجی اسباب و محرکات کو ہی ختم کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ افراد کے قلوب کے تزکیہ کا بھی انتظام کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ارتکاب جرائم صرف سماجی حالات کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کے باطن سے بھی ہے۔ اس لیے جب تک افراد کے قلوب کا تزکیہ نہ ہوگا، سماج سے جرائم کے اسباب و محرکات کو کُلیۃً ختم نہیں کیا جا سکتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال ہم کو خود جدید مغربی معاشرہ کے اندر ملتی ہے۔

امریکہ میں امتناع شراب کے قانون کی تنفیذ سے پہلے اس اُمّ الخبائث کی اخلاقی و جسمانی مضرتوں سے امریکی عوام کو باخبر کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا، تمام ذرائع ابلاغ کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا گیا، اور کروڑوں روپیے اس اصلاحی مہم پر خرچ

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ حاطب ابن بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی مگر وہ پکڑ لیے گئے۔ اونٹنی کا مالک ان کو لے کر حضرت عمر فاروق کی خدمت میں آیا۔ غلاموں نے چوری کا اقرار کر لیا اور خلیفہ نے ان کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دے دیا لیکن اسی وقت آپ کو یہ معلوم ہوا کہ غلاموں نے چوری فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے غلاموں کے مالک کو بلوا کر سرزنش کی اور فرمایا: تم ان سے کام لیتے ہو اور پیٹ بھر کھانا بھی نہیں دیتے۔ اب ان کے بجائے میں تم کو سزا دوں گا چنانچہ مالک سے اونٹنی کی قیمت معلوم کر کے انہی سے اس کی قیمت دلوائی۔ تفصیل کے لیے دیکھئے، اعلام الموقعین (حافظ ابن قیم) ج ۳ ص ۲۳

کیے گئے، اور عوام کی اکثریت کی رائے سے جنوری ۱۹۲۰ء میں اس کی کشید اور خرید و فروخت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ لیکن ۱۳ سال کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۳۳ء میں حکومت امریکہ کو یہ قانون واپس لینا پڑا کیوں کہ امریکی عوام تادیر اس "بنتِ عنب" کے فراق کو برداشت نہ کر سکے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوا کہ شراب کی مضرتوں سے امریکی عوام کو آگاہ تو ضرور کیا گیا لیکن ان کے قلوب و نفوس کے تزکیہ کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف جب ۳ھ میں اسلام نے تحریم خمر کا اعلان کیا تو وہی عرب جو اس دخترِ رز کی محبت میں سرتاپا غرق تھے، اس سے اس طرح متنفر ہو گئے جیسے اس سے پہلے ان کے نزدیک اس سے زیادہ نامرغوب اور قابل نفرت کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ تحریم خمر کے اعلان کے ساتھ ہی ہر گھر میں شراب کے جام و مینا چکنا چور کر دیے گئے، اور شراب مدینہ کی گلیوں میں پانی کی طرح بہہ نکلی۔ اسلامی سماج سے اس امّ الخبائث کو اتنی آسانی کے ساتھ اس لیے نکال باہر کیا گیا کہ تحریم خمر کے قانون کی تنفیذ سے پہلے افراد کے قلوب و اذہان کا بڑی حد تک تزکیہ کر دیا گیا تھا، اور حکم خدا و رسول کی اطاعت کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔

اسلام اور مغرب کے تصورِ جرم و سزا میں جو فرق پایا جاتا ہے یہ دراصل اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ دونوں کے تعزیری قوانین اپنی شکل و صورت میں قطعاً مختلف ہیں۔ اب اگر اہل مغرب کو اسلامی سزائیں ظالمانہ اور غیر مہذبانہ نظر آتی ہیں تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ عام طور پر لوگ اسلامی سزاؤں کی سختی کو تو دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تعزیری قوانین کس طرح کے سماج کے لیے وضع کیے گئے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین اپنی شکل و نوعیت کے اعتبار سے صرف ایک مخصوص کردار کی حامل اسلامی ریاست کے لیے ہی موزوں ہیں، مغربی طرز کی سوسائٹی کے لیے وہ قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اگر کسی عریاں اور بے کردار سوسائٹی میں ان قوانین کو نافذ کر دیا جائے تو وہ سوسائٹی کے افراد کی نظر میں یقیناً ظالمانہ اور غیر مہذبانہ نظر آئیں گے۔ لیکن یہی قوانین جب ایک صالح اور باکردار سوسائٹی کے افراد پر نافذ کیے جائیں گے تو وہ انھیں اپنے لیے باعث رحمت تصور کریں گے۔ اور اگر ایسی باکردار سوسائٹی میں مغرب کے تعزیری قوانین نافذ کر دیے جائیں تو وہ سوسائٹی کے افراد کی نظر میں اسی طرح غیر مہذبانہ نظر آئیں گے

Marfat.com

جس طرح اہل مغرب کی نظر میں اسلامی قوانین غیر مہذبانہ نظر آتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قوانین سماجی حالات و ضروریات کے تابع ہیں جس طرز تمدن کا حامل سماج ہوگا اسی کے مطابق اس کے قوانین بھی ہوں گے۔ اسلام ایک مخصوص طرز زندگی اور فلسفۂ حیات کا حامل ہے اس لیے اس کے تعزیری قوانین اسلامی ریاست کے حالات و ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ مغرب یا مغربی علوم کے فاضلین کو ان قوانین پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیوں کہ ان کے نظریۂ حیات اور اسلامی نظریۂ حیات میں بعد المشرقین ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی شخص اسلامی قوانین پر زبان اعتراض دراز کرتا ہے تو یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ قانون کی روح اور قانون و سماج میں تعلق کی نوعیت سے بالکل ناواقف ہے۔

ایک مخصوص کردار کی حامل اسلامی ریاست میں بھی اسلام اپنے تعزیری قوانین کو یکلخت نافذ نہیں کر دیتا بلکہ جیسا کہ ہم پہلے آپ کو بتا چکے ہیں، احوال و ظروف کی پوری رعایت کرتے ہوئے تدریج کی راہ اختیار کرتا ہے۔ جیسے جیسے تزکیۂ نفس اور تطہیر معاشرہ کا کام آگے بڑھتا جاتا ہے اسلام کے تعزیری قوانین کی مختلف دفعات کی تنفیذ بھی ہوتی رہتی ہے۔

اسلام اپنے تعزیری قوانین کے اطلاق میں بھی بہت زیادہ حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے تاکہ کسی معصوم اور بے گناہ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تعزیری قوانین میں کسی شخص کو مجرم اور مستوجب سزا قرار دینے کے لیے درج ذیل دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی تکمیل ضروری ہے۔ پہلی شرط عینی گواہوں کی شہادت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ (نساء: ۱۵)

تمہاری عورتوں میں سے جو بدچلنی (فعل زنا) کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لے لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند کر دو

Marfat.com

یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی سبیل (نجات) نکال دے۔

اور دوسری شرط مجرم کا اقبال جرم ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تم میں سے جو آدمی ان برے افعال میں سے کسی کا مرتکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ میں چھپا رہے لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے۔"[1]

اسلامی سزاؤں میں جو سزا مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ بے رحمانہ ہے وہ فعل زنا کی سزائے رجم ہے لیکن اسلام اس سزا کے نفاذ کے لیے چار عینی گواہوں کی شرط کو جیسا کہ مذکورہ آیت قرآنی سے واضح ہے، لازم ٹھہراتا ہے۔ آپ انصاف سے بتائیں کہ عام حالات میں چار عینی گواہوں کا ملنا ممکن ہے؟ اگر مجرم خود اقبال جرم کر لیتا ہے تو بھی اسلام سزا کے نفاذ میں جلدی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ہدایت کرتا ہے کہ خوب چھان بین کرنے کے بعد ہی اسے سزا دی جائے۔ میں اس سلسلے میں عہد نبوی کا ایک واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

ابوداؤد میں ہے کہ مالک بن ماعز اسلمی جو قبیلۂ اسلم کا ایک یتیم لڑکا تھا اور جس کی پرورش حضرت ہزال بن نعیم کے گھر میں ہوئی تھی، وہ ایک آزاد کردہ لونڈی سے زنا کر بیٹھا۔ حضرت ہزال کے کہنے پر وہ حضور کے پاس گیا اور کہا:۔

"یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے، میں نے زنا کیا ہے" آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: ارے چلا جا، اور اللہ سے توبہ و استغفار کر" مگر پھر اس نے سامنے آ کر وہی بات کہی اور آپ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری بار وہی بات کہی اور آپ نے منہ پھیر لیا۔ حضرت ابوبکر نے اس کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو اگر اب تم نے چوتھی بار یہی کہا تو حضور تم کو ضرور رجم کرا دیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔ اب حضور اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے فرمایا: شاید تم نے بوس و کنار کیا ہوگا یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی یا نگاہِ بد ڈالی ہوگی؟ اس نے کہا "نہیں" آپ نے پوچھا: کیا تو اس سے ہم بستر ہوا ہے؟ اس نے کہا "ہاں" آپ نے پھر پوچھا: "کیا تو نے اس سے مباشرت

[1] احکام القرآن جصاص۔

Marfat.com

کی ہے؟" اس نے کہا "ہاں"

اس کے بعد آپ نے متعدد ایسے الفاظ زبان مبارک سے ارشاد فرمائے جن کو عام حالات میں آپ کبھی زبان پر نہیں لاتے تھے لیکن ان الفاظ کا استعمال آپ نے بجبر و اکراہ صرف اس لیے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس نے واقعی زنا کیا ہے۔ آخر میں آپ نے پوچھا:

"کیا تم کو معلوم ہے کہ زنا کیا چیز ہے؟" اس نے کہا "ہاں میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا ہے جو ایک شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے"۔ آپ نے پوچھا: کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟" اس نے کہا "ہاں" آپ نے پوچھا: تو نے شراب تو نہیں پی ہے؟" اس نے کہا "نہیں" ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپ نے اس کے محلہ والوں سے پوچھا: یہ دیوانہ تو نہیں؟" انھوں نے کہا "ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی ہے۔" آپ نے ہزال سے فرمایا: کاش تم نے اس کے عیب کو ڈھانک دیا ہوتا تو تمہارے لیے یہ زیادہ بہتر ہوتا" اس کے بعد آپ نے ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرمادیا[1]

اس واقعہ سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں گناہوں کی پردہ پوشی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ گناہ کی پردہ پوشی کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام گناہ کو کوئی معیوب چیز نہیں سمجھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ گناہ کے واقعات کو کرید کرید کر منظر عام پر نہ لایا جائے، کیوں کہ گناہ جب تک پوشیدہ حالت میں ہوتا ہے وہ اس گندگی کی طرح ہے جو کسی ایک ہی جگہ میں بند ہو اور اس کی بدبو سے لوگ بے خبر ہوں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ارتکاب گناہ کے بعد گنہگار کسی وقت اپنے گناہ پر نادم ہو کر تائب ہو جائے اور اس طرح برائی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے۔ لیکن جب گناہ طشت از بام ہو جاتا ہے تو پھر وہ ہر محفل کا موضوع گفتگو بن جاتا ہے اور اس طرح بند گندگی پھیل کر سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اب اس

---

[1] ابوداؤد کے علاوہ بخاری، مسلم اور ترمذی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ دیکھئے جمع الفوائد جلد ۱ ص۲۹۲

Marfat.com

کے ازالہ کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ گناہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے خواہ اس کے لیے ایک گنہگار کے وجود ہی کو ختم کر دینا پڑے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام مجرموں کو سزا دینے میں شقاوت اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن یہ محض مخالفین اسلام کا پروپیگنڈہ ہے تاکہ اسلام کو رسوا اور بدنام کیا جائے۔ اس باب میں اسلام کی جو روشن تعلیمات ہیں ہم ان کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

● مجرم کو تازیانے اس طرح لگائے جائیں کہ اسے جسمانی اذیت تو پہنچے لیکن اسے مجروح نہ کر دے اور مارنے والا اس طرح تازیانے لگائے کہ بغل نہ کھلے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ مارنے والے کو ہدایت فرماتے تھے کہ: اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے اور ہر عضو کو اس کا حق مل جائے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو مطیع بن الاسود کے پاس بھیجا اور ان سے فرمایا: "کل صبح اس کو تازیانے لگاؤ" ٹھیک اس وقت جب وہ نوجوان کو ضرب شدید لگا رہے تھے، حضرت عمرؓ آ گئے، اس منظر کو دیکھا تو فرمایا: تو نے تو اسے مار ہی ڈالا، کتنے تازیانے لگا چکے ہو؟ اسود نے کہا: ۶۰ تازیانے آپ نے فرمایا: بیس تازیانے اس سے ساقط کر دو تاکہ تم نے جو شدید تازیانے لگائے ہیں وہ باقی بیس تازیانوں کے لیے قصاص بن جائیں، اسے اب بیس تازیانے نہ لگاؤ۔[1]

● ضرب معتدل ہونی چاہیے کیوں کہ سزا کا مقصد ایلام ہے نہ کہ کھال ادھیڑ لینا۔ ابن عمرؓ نے جب اپنی پڑوسن کو تازیانے لگائے تو ان کے لڑکے نے اعتراض کیا اور کہا: کیا اللہ کے قول ولا تاخذکم بہما رأفۃ فی دین اللہ کا یہی مفہوم ہے؟ آپ نے فرمایا: اے بیٹے (تم نے غالباً یہ خیال کیا کہ میں پڑوسن کے ساتھ نرمی برت رہا ہوں) اللہ نے ہمیں اس کو مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ ہم اس کے سر پر تازیانے لگائیں۔ میں نے تازیانے اس طرح لگائے ہیں کہ اسے (منشائے شریعت کے مطابق) اذیت پہنچا دوں۔[2]

● مارنے میں چہرہ اور شرم گاہ کو بچایا جائے، صرف پشت پر تازیانے لگائے جائیں، ضرب لگاتے وقت مرد کے تمام کپڑے بجز پاجامہ کے، اتار دیئے جائیں، لیکن عورت کے کپڑے نہ

---

[1] تفسیر القرطبی ج ۱۲ صـ ۱۶۳ [2] احکام القرآن، جصاص ج ۳ صـ ۳۱۹

Marfat.com

اُتارے جائیں بلکہ اس کے کپڑوں کو مضبوطی سے باندھ دینا چاہیئے تاکہ بوقت ضرب اس کا جسم کھل نہ جائے۔ مرد کو کھڑا کر کے اور عورت کو بٹھا کر تازیانے لگائے جائیں۔[1]

• سخت سردی اور سخت گرمی میں مارنا ممنوع ہے۔ مجرم کو باندھ کر مارنا بھی ممنوع ہے الا یہ کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرے۔

• مجرم اگر مریض ہے تو اس کو تازیانے اسی وقت لگائے جائیں جب وہ صحت یاب ہو جائے لیکن اگر صحت یابی کی کوئی اُمید نہ ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی سے صرف ایک ضرب لگا دینا کافی ہے تاکہ قانون کا منشا پورا ہو جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بوڑھا شخص فعل زنا کا مرتکب ہوا تو آنحضورؐ نے اس کو یہی سزا دلائی تھی۔[2]

• اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل کا مرحلہ اور زمانۂ نفاس گزر جانے کے بعد ہی اس کو سزا دی جائے، اور اگر اسے رجم کرنا ہو تو زمانۂ رضاعت تک سزا کو موخر کیا جائے یہاں تک کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے۔

سزا کے باب میں اسلام کی ان روشن تعلیمات و ہدایات کے بعد بھی کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ اور غیر مہذبانہ ہیں؟ یہ جسارت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو خود مجرمانہ داعیات و میلانات کا حامل ہوگا، اور جس کے نزدیک بے حیائی و بدکاری کوئی قابل نفرین چیز نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تعزیری قوانین کو نظر انداز کر کے ایک پاکیزہ اور عدل و راستی پر مبنی انسانی معاشرے کا قیام ناممکن ہے۔

اُخروی سزا

روز آخرت کافروں اور مجرموں کو ان کے برے اعمال کی پاداش میں جو سزائیں ملیں گی وہ دو طرح کی ہیں، ایک کو قرآن مجید نے نار جہنم سے تعبیر کیا ہے مثلاً ایک جگہ فرمایا:۔

---

[1] احکام القرآن جصاص ج ۳، ص ۳۲۲، زاد المسیر فی علم التفسیر ج ۶، ص ۸۔

[2] احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔

Marfat.com

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۠ (سورہ تغابن: ۱۰)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ اُولٰٓىٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ ؕ (بینہ: ۶)

بیشک اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے بھی کفر اختیار کیا وہ آتش جہنم میں ڈالے جائیں گے، جہاں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔

اور دوسری سزا کو اللہ تعالیٰ کے دیدار و کلام سے محرومی کی شکل میں پیش کیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا:

كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ؕ (تطفیف: ۱۵)

ہرگز نہیں، یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے دیدار سے محروم کر دیے جائیں گے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اُولٰٓىٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ؕ (آل عمران: ۷۷)

ایسے ہی لوگوں کے لیے روز آخرت کوئی حصہ نہیں ہے۔ نہ تو اللہ اُن سے کلام فرمائے گا نہ قیامت کے دن ان کی طرف (نظر محبت سے) دیکھے گا اور نہ ہی ان کو (گناہوں سے) پاک وصاف کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہ ایک ایسی سزا ہے جس سے زیادہ غم انگیز، اضطراب آفریں اور قلب و روح کو پگھلا دینے والی کوئی دوسری سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی شقاوت و نامرادی کی بات ہے کہ اس سے بڑی نامرادی و سیاہ بختی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک عاشق اپنے محبوب کی طرف سے پہنچنے والی ہر تکلیف کو ہنسی خوشی گوارا کر سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے سلسلۂ کلام و پیام بند کر دے۔ یہ ایک محبوب

Marfat.com

کی خفگی وناراضگی کی انتہائی حالت ہے اور ایک سچّے عاشق کے لیے سوہان روح سے کم نہیں ہوتی۔ وہ محبوب کے فراق میں ہر رنج والم کو صرف اس اُمید میں جھیل لے جاتا ہے کہ شاید ایک دن اس کا محبوب اس سے راضی ہوکر اپنے دیدار وکلام سے نواز دے۔ لیکن اگر اسے کسی لمحہ بھی بالیقین یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا محبوب اس سے کبھی راضی نہ ہوگا، اور وہ اس کے روئے تاباں کے دیدار اور اس کے سخن دل نواز سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا ہے تو وہ لمحہ اس کے لیے پیام مرگ ثابت ہوگا۔ اس وقت اس کے جسمانی اضطراب اور روحانی کرب و التہاب کا جو عالم ہوگا اس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو بادۂ عشق ومحبت کا جرعہ خوار ہوگا۔

جہنّم کی سزائیں کن لوگوں کے لیے ہیں

جہنم کی سزائیں فی الواقع اُنہی لوگوں کے لیے ہیں جو اس دنیا میں برے اعمال کرتے ہیں لیکن توبہ واستغفار نہیں کرتے، بلکہ دیدہ ودانستہ ایک کے بعد دوسرے برے عمل کے لیے مستعد رہتے ہیں، اور اسی حالتِ فسق وفجور میں اس دارفانی سے رحلت کرجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہنم کافروں، مشرکوں، مجرموں اور سرکشوں کے لیے ہے۔

اُخروی سزاؤں کا مادّی پہلو

جہنّم کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں عذاب والم کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھنچ جاتی ہے جس سے زیادہ المناک تصویر کا ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید نے جہنّم کی جو کیفیات بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مقام تعذیب ہے جہاں مجرموں اور سرکشوں کو ان کے افعال بد کی سزائیں ملیں گی۔ ان سزاؤں پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزائیں اپنی شکل ونوعیت میں مادّی خصائص رکھتی ہیں یعنی یہ وہی سزائیں ہیں جو اس عالم مادّی میں مجرموں اور بدکاروں کو دی جاتی ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا:

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا

Marfat.com

سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝ (الحاقہ: ۳۷)

(فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑ واور اس کے گلے میں طوق ڈالو پھر اس کو دوزخ میں ڈھکیل دو۔ پھر اس کو ایک ستر گز کی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ شخص نہ تو خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھتا تھا، اور نہ خود کو غریبوں کو کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔ آج کے دن اس شخص کا کوئی بھی دوست دار نہیں ہے، اور زخموں کے دھوون کے سوا جو صرف خطا کاروں کا کھانا ہے، اس کے لیے کوئی دوسرا کھانا بھی نہیں ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝ (غاشیہ: ۴-۷)

وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور کھولتے ہوئے چشمے کا پانی ان کو پلایا جائے گا، اور کانٹوں کے سوا ان کو اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا جس کو کھا کر نہ تو وہ موٹے ہو سکیں گے اور نہ ہی ان کی بھوک رفع ہو سکے گی۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۝ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝

(دخان: ۴۹)

اس شخص کو پکڑو اور اس کو گھسیٹتے ہوئے جہنم کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ، پھر اس کے سر پر تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو (اور کہو) لے اس عذاب کا مزہ چکھ تو (دنیا میں) بڑا معزز و مکرم تھا۔

اُخروی سزاؤں کی ان مادی خصوصیات کو دیکھ کر ہمارے علماء کی ایک بڑی تعداد کا یہ خیال ہے کہ عالم آخرت میں مجرموں کو جو سزائیں ملیں گی وہ اپنی شکل و نوعیت کے اعتبار

Marfat.com

سے قرآنی الفاظ وبیان کے عین مطابق ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جزا اور سزا دونوں ہی تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہیں مثلاً ایک جگہ فرمایا :-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا
رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَ
لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ
مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا [1] (بقرہ : ۲۶،۲۵)

اور (اے پیغمبر) جو لوگ ایمان لے آئیں اور اچھے عمل کریں ان کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے، یہ وہی پھل ہے جو اس سے پہلے ہمیں دنیا میں عطا ہوا تھا۔ اور باہم دگر ملتی جلتی ہوئی چیزیں ان کے سامنے آئیں گی۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ اس بات سے ہرگز نہیں شرماتا کہ (حقیقت سمجھانے کے لیے) مچھر یا اس سے بھی زیادہ حقیر چیز کی تمثیل دے۔ پس جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ (الٰہی تمثیلوں کے ذریعہ) جان لیتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہے ان کے پروردگار کی طرف سے ہے لیکن جن لوگوں نے انکارِ حق کی راہ اختیار کی ہے وہ (ان تمثیلات کو سن کر) کہتے ہیں کہ ایسی تمثیل بیان کرنے سے اللہ کا منشا کیا ہے؟

دوسری جگہ فرمایا :-

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰۗىِٕكَةً ۠ وَّمَا
جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ

---

[1] یہ جزا کی تمثیل ہے اور اس پر مفصل گفتگو گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

Marfat.com

الْکٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا ۔ (مدثر: ۲۷-۳۱)

اور تم کیا جانو کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی، کھال جھلس کر جسم کا رنگ و ہیئت بگاڑ دے گی۔ اُنّیس کارکن اس پر مقرر ہیں۔ ہم نے دوزخ کے یہ کارکن فرشتے بنائے ہیں، اور ان کی تعداد کو کافروں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے، تاکہ اہلِ کتاب (سننے کے ساتھ) یقین کرلیں، اور ایمان لانے والوں کا ایمان اور بڑھ جائے اور اہلِ کتاب اور مومنین کسی شک میں نہ رہیں، اور جن کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے اور منکرینِ حق یہ کہیں کہ ایسی مثال بیان کرنے سے اللہ کا منشا کیا ہے؟

روزِ آخرت انسانوں کے اعمال کے نتائج کن کن صورتوں میں ظاہر ہوں گے، ان کا حقیقی ادراک انسان کی محدود عقل و فہم کے سبب ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اعمال کے روحانی نتائج کو مادّی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے تاکہ ہم اس دنیا میں اعمالِ خیر و شر کی حقیقت اور اس کے نتائج سے آگاہ ہوسکیں۔ اگر قرآن عذابِ آخرت کو اُن مادّی صورتوں میں پیش نہ کرتا جن مادّی صورتوں کو ہم اپنی دنیا میں عذاب کی صورت سمجھتے ہیں تو انسان برے اعمال کے عواقب کی صحیح حقیقت سے واقف نہ ہوسکتا، اور نہ ہی برے اعمال کے ارتکاب سے اپنے اندر کوئی خوف محسوس کرتا، کیوں کہ کلفت و آزار کی محسوس صورتیں ہی اس کے اندر خوف پیدا کرسکتی ہیں، اور اس کو کسی فعل کے ارتکاب سے روک سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر آگ ایک اذیت پہنچانے والی چیز ہے۔ انسان اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر اس کی اذیت رسانی کا یقین رکھتا ہے، اور اسی لیے وہ کبھی دیدہ و دانستہ اس میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالتا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے اور اس کے نتائج کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انسان تاریخ کے ہر دور میں کسی فرد یا جماعت کو کسی الزام میں جو سب سے بڑی سزا تجویز کی گئی ہے وہ یہی کہ اسے آگ میں ڈال دیا گیا، خود قرآن مجید میں "اصحاب اخدود" اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگ تعذیب جسمانی کا سب سے زیادہ الم انگیز اور خوفناک ذریعہ ہے۔

تعذیب و ایلام کے اس مادّی پہلو کو سامنے رکھ کر جب ہم نار یا نارِ جہنم کے الفاظ پر جو

Marfat.com

قرآن مجید میں کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں، غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقصود ہر جگہ انتہائی سزا کا تصوّر دلانا ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ آتشِ جہنّم سے مراد وہی آگ ہے جو ہماری اس دنیا میں موجود ہے۔ اس کی حیثیت ایک استعارہ کی ہے۔ روزِ آخرت ایک مجرم و سرکش کو اپنے بُرے اعمال کی پاداش میں جو تکالیف پہنچیں گی، اور اس کے اضطراب و ہیجان کا جو عالم ہوگا وہ کچھ اس طرح کا ہوگا جیسے اس دنیا میں آگ سے جلنے والے شخص کا ہوتا ہے۔ ہم فی الواقع عذابِ نار کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ ہمارے لیے بس یہ جان لینا کافی ہے کہ اس دن ہمارے بُرے اعمال کے نتائج بُری صورتوں میں ظاہر ہوں گے، اور ہمارے لیے موجبِ ذلّت وخواری اور باعثِ رنج و الم ہوں گے۔

جہنم کی حقیقت

عالمِ آخرت میں سزاؤں کی مادّی خصوصیات کو دیکھ کر بعض نادان اربابِ علم و خرد جہنّم کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ عالمِ غیر مادّی میں مادّی احوال و مقامات کا وقوع کیوں کر ممکن ہے؟ اس سلسلے میں مسلم فلاسفہ نے جو توجیہات پیش کی ہیں وہ کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال نے اپنی کتاب "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں لکھا ہے کہ "جہنّم کوئی جگہ نہیں بلکہ تادیب کا ایک عمل ہے"۔[1]

ہمارے علماء و فلاسفہ نے بحث و گفتگو میں یہ حقیقت بھلادی کہ وہ جس موضوع پر کلام کر رہے ہیں وہ عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے، اور اُن امورِ غیب تک انسانی فکر و فہم کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ فی الواقع قرآن مجید میں جنّت اور جہنّم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ انسان کی فطری فہم و استعداد کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے، اور انھیں الفاظ اور اسلوبِ کلام میں حقیقتِ حال کو کھولا گیا ہے جو اس کے لیے قابلِ فہم تھے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کی حیثیت تمثیلاتی ہے جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں

---

[1] تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ صفحہ ۱۸۶ (مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

Marfat.com

بیان کر چکے ہیں۔

جنت اور دوزخ کے متعلق جتنی آیات قرآن مجید میں آئی ہیں ان پر غور کریں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہم کو اعمال کے اثرات و نتائج سے خبردار کر رہی ہیں۔ ان آیات میں اعمال کے اچھے نتائج کو جنت کی کامرانیوں اور لذتوں کی صورت میں اور برے نتائج کو دوزخ کی تکالیف و آزار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں برے اعمال کے برے نتائج کو جہنم سے اور اچھے اعمال کے اچھے نتائج کو جنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کو فلسفیانہ اور علمی زبان میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیں کہ اس عالم مادی میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اپنے خواص و نتائج نہ رکھتی ہو مثلاً آگ کا خاصہ جلانا، سنکھیا کا خاصہ ہلاکت، پانی کا خاصہ ٹھنڈک و رطوبت، شہد کا خاصہ مٹھاس اور ایلوا کا خاصہ تلخی ہے ان اشیاء کے یہ خواص کسی حالت میں کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آگ میں کسی نے ہاتھ ڈالا ہو اور وہ جلنے سے بچ گیا ہو، سنکھیا کھائی ہو اور اس کا نتیجہ ہلاکت کی صورت میں سامنے نہ آیا ہو۔ ان اشیاء کے نتائج و خواص پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان سب میں ایک مشترک قانون عمل کام کر رہا ہے جس کو ہم مکافات عمل کا قانون کہہ سکتے ہیں۔ یعنی جیسے ہی کوئی عمل واقع ہوتا ہے اس کا ایک ردّعمل ضرور سامنے آتا ہے جسے ہم اس فعل کی مکافات کہہ سکتے ہیں۔ آگ میں ہاتھ ڈالنا ہمارا ایک عمل ہے اس کا ردّعمل جلنے کی صورت میں سامنے آتا ہے جو پہلے عمل کی مکافات ہے۔

کائنات ہستی کا کوئی گوشہ اس کلیہ یعنی مکافات عمل کے قانون سے خالی نہ ملے گا جب صورت حال یہ ہے تو پھر انسانی اعمال کے خواص و اثرات پر کسی کو حیرت کیوں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج متعین کر دیے ہیں، اور یہ خواص و نتائج ہر حالت میں اپنا ظہور رکھتے ہیں۔ یہ غیر متبدل قانون فطرت ہے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں کہ اعمال کے اثرات و نتائج کو تبدیل کر دے۔

جو قانون مکافات اس دنیا کی ہر چیز میں جاری و ساری ہے وہی قانون مکافات عالم آخرت کے لیے بھی ہے۔ وہ قانون مکافات کیا ہے؟ یہی کہ اچھے اعمال کا بدلہ اچھا

Marfat.com

اور برے اعمال کا بدلہ بری صورت میں نکلے گا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

"تم گیہوں بوتے ہو اور تمہارے دل میں کبھی یہ خدشہ نہیں گزرتا کہ گیہوں پیدا نہ ہوگا۔ اگر کوئی تم سے کہے کہ ممکن ہے گیہوں کی جگہ جوار پیدا ہو جائے تو تم اسے پاگل سمجھو گے، کیوں؟ اس لیے کہ فطرت کے قانون مکافات کا یقین تمہاری طبیعت میں راسخ ہو گیا ہے۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی یہ خطرہ نہیں گزر سکتا کہ فطرت گیہوں لے کر اس کے بدلہ میں جوار دے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ اچھے قسم کا گیہوں لے کر برے قسم کا گیہوں دے گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بدلہ دینے میں قطعی اور شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ پھر بتاؤ کہ جو فطرت گیہوں کے بدلے گیہوں اور جوار کے بدلے جوار دے رہی ہے کیوں کر ممکن ہے کہ اچھے عمل کے بدلے اچھا اور برے عمل کے بدلے برا نتیجہ نہ رکھتی ہو۔"[1]

حقیقت یہی ہے کہ انسان آج جو کچھ کر رہا ہے کل اس کا نتیجہ اسے ضرور دیکھنا ہے۔ جس طرح سنکھیا کھا کر ہلاک ہونے والا شخص خود قابلِ الزام ہے نہ کہ سنکھیا، اسی طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے بڑا ظلم کیا جو آگ میں جلانے کی خاصیت رکھ دی اور اس نے ہاتھ جلا دیا۔ کیا آگ کی خاصیت سے وہ واقف نہ تھا، کیا اس کی عقل نے اسے یہ نہ بتایا تھا کہ آگ جلاتی ہے، کیا اس کا تجربہ و مشاہدہ اس امر کی تصدیق نہ کرتا تھا کہ آگ نے بارہا جلانے کا عمل کیا ہے؟ اگر وہ ان سب باتوں سے واقف ہو کر بھی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو وہ ہر رنج و تکلیف کے لیے خود قابلِ ملامت ہے۔ یہی حال ہمارے اعمال کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی، ضمیر بخشا، تمیزِ خیر و شر کی صلاحیت اس کی فطرت میں ودیعت کی، مزید برآں اپنے انبیاء و رسل اور اپنی کتابوں کے ذریعہ اچھے اور برے اعمال اور ان کے نتائج خوب و زشت سے انھیں صاف صاف باخبر کر دیا۔ اب اگر ان تمام

---

[1] ترجمان القرآن جلد اوّل، تفسیر سورہ فاتحہ، صفحہ ۲۱۵

Marfat.com

الٰہی انتظامات کے باوجود کوئی شخص برے اعمال کرتا ہے تو اس کے نتائج کو بھگتنے کے لیے بھی اسے تیار رہنا چاہیئے۔ روز آخرت جن لوگوں کو اعمالِ بد کے بدلے برے نتائج یعنی جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا وہ ہرگز یہ نہ کہہ سکیں گے کہ وہ نتائجُ اعمال سے بے خبر تھے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ یہ اللہ کا ظلم نہ ہوگا خود ان کا اپنے آپ پر ظلم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ۴۶)

جس نے اچھا کام کیا تو اس کا اجر اسی کے لیے ہے، اور جس نے برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اُسی کے اوپر ہے، اور تمہارا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جنّت اور جہنّم دونوں انسان کے اپنے ہی اعمال کے دو مختلف نتائجُ ہیں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نتائجُ خیر سے خوش ہوتا ہے کہ وہ خود سراپا خیر ہے، اور نتائجُ بد سے ناخوش ہوتا ہے کہ وہ برائیوں سے منزّہ اور پاک ذات ہے۔ ایک حدیث قدسی میں اسی بات کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:

"اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد میں پیدا ہوں گے، اور تمام انس و جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری سلطنت میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد میں پیدا ہوں گے، اور تمام انس و جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گزر چکے اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر انسان کو اس کی منہ مانگی مراد بخش دیتا تو اس سے میرے خزانۂ رحمت و بخشش میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی ایک سوئی کے

Marfat.com

تاکے کو سمندر میں داخل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو
یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنھیں میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا
ہوں اور پھر اُنھیں جوں کا توں تمہیں واپس کر دیتا ہوں (یعنی ان کے نتائج کو
بغیر کمی و بیشی کے تمہیں واپس کر دیتا ہوں) پس تم میں جو شخص اچھائی پائے اسے
چاہیئے کہ وہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو اس کے علاوہ یعنی برائی پیش
آئے اسے چاہئے کہ وہ اپنے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے"۔[۱]

اعمال کے برے نتائج کو جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، قرآن مجید نے مادی صورتوں میں جس کا دوسرا نام جہنم ہے، صرف اس لیے پیش کیا ہے تاکہ انسان ان کی شدت و ہولناکی کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس دنیا میں برے افعال کے ارتکاب سے باز آجائے۔ سزاؤں کی مادی صورتوں کو دیکھ کر جہنم کے وجود سے انکار کرنا قلتِ علم و تدبر کی علامت ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں مکافاتِ عمل کے قانون کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ان کو لازماً یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ برے اعمال کے اثرات و نتائج کا ظہور یقینی ہے خواہ اس کو کسی بھی نام سے موسوم کیا جائے۔

بعض اربابِ نظر اعمال کے نتائج کو تو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ نتائج کسی غیر مادی دنیا میں نہیں بلکہ اسی عالمِ آب و گِل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال حقیقتِ واقعہ کے خلاف ہے۔ یہ ایک مشاہداتی حقیقت ہے کہ کتنے ہی برے افعال کے نتائج اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے، اور کتنے ہی مجرم و بدکار اپنے اعمالِ بد کے نتائج سے اس دنیا میں صاف بچ نکلتے ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اعمال کے اثرات و نتائج کے ظہور کے لیے ایک دوسری دنیا کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ اس دنیا کے وجود کو تسلیم کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کیوں کہ یہ اعمالِ بد کے اثرات و نتائج کے ظہور ہی کا دوسرا نام ہے۔

کیا جہنم بھی خدا کی رحمت ہے؟

ہمارے بعض علماء کہتے ہیں کہ جہنم بھی خدا کی رحمت ہے اور اس کی حیثیت شفاخانے

---

[۱] مسلم رواہ ابوذرؓ

کی ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں :۔

"دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے بلکہ وہ بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے۔ بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں۔ درد، اعضا شکنی، شدت تشنگی، سوزش جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی دوا دی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذارسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عام صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔"[۱]

اس تمثیل میں بظاہر چاہے کتنا ہی حسن معلوم ہوتا ہو، اور اس کا منطقیانہ انداز بیان چاہے کتنا ہی موثر ہو لیکن میرے نزدیک یہ طرز استدلال مغالطہ آمیز ہے۔ جہنم کو شفا خانہ قرار دینا جہنم کی سزاؤں یا دوسرے لفظوں میں اعمالِ بد کے برے نتائج کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ جہنم کی اس توجیہہ کی ضرورت ہمارے علماء کو صرف اس لیے محسوس ہوئی کہ خدا کی رحمت و رافت کے خلنے میں جہنم کا وجود کچھ بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ جو خدا رحمان و رحیم ہے، جس کی رحمت و نوازش کی فیض رسانیوں سے اس عالم کا ذرّہ ذرّہ مستفید ہو رہا ہے، جس کا لطف و کرم بے نہایت، جس کے الطاف و عنایات بے اندازہ، جس کا عفو و بخشش بے حساب بھلا وہ خدا اپنے بندوں کے ساتھ قہر و غضب، سنگ دلی و بے مروّتی اور تعذیب کا معاملہ

---

[۱] سیرت النبی جلد چہارم، صفحہ ۷۷

Marfat.com

کیسے کر سکتا ہے؟

فی الواقع جہنّم نہ قید خانہ ہے اور نہ شفاخانہ اور نہ ہی جہنّم کی سزاؤں کی علت خدا کا قہر و غضب یعنی جذبۂ انتقام ہے کہ وہ اس عیب سے بالکل پاک ہے، اور نہ ہی اس کا مقصد تربیت و اصلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت و شفقت سے اس دنیا میں انسانوں کی تربیت و اصلاح کا مکمل انتظام فرما دیا ہے یعنی اپنے انبیاء اور کتابیں بھیج کر انھیں اعمال کے نتائج سے آگاہ کر چکا ہے، اس لیے آخرت، تربیت و اصلاح کے بجائے نتائج اعمال کے ظہور کا دن ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہنّم ایک ایسی حالت کا نام ہے جہاں برے انسان اپنے برے اعمال کے نتائج کے قالب میں ڈھل کر زندگی گزاریں گے جب تک اللہ تعالیٰ ان کی اس زندگی کو قائم رکھنا چاہے گا۔

جہنم کا وجود دراصل خدا کے قانون عدل کے ظہور سے وابستہ ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اس عالم ہست و بود میں ہر طرف اس کی ربوبیت و رحمت کا ابر گہربار سایہ گستر ہے۔ یہ اس کی رحمت بے پایاں ہی کا نتیجہ ہے کہ کفار و مشرکین بھی اس دنیا میں اس کی رحمتوں سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ اور زندگی کا ہر سر و سامان حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن آخرت جس دن کا نام ہے وہاں اس کی رحمت کے ساتھ ساتھ اس کے قانون عدل کا بھی ظہور ہو گا۔ یہ قانون ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا کہ آج کون اس کی رحمت کا مستحق ہو گا اور کون اس سے محروم کر دیا جائے گا۔ اس کی رحمت و عذاب کا قانون کیا ہے؟ اس کا سراغ ہم کو موسیٰ علیہ السلام کی دعائے استغفار میں ملتا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۚ (اعراف: ۱۵۵، ۱۵۶)

تو ہی ہمارا کارساز ہے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہم پر رحم فرما، اور تو ہی سب سے اچھا معاف کرنے والا ہے۔ تو اس دنیا میں بھی ہم کو بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

Marfat.com

قَالَ عَذَابِیٓ اُصِیبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

"اس نے فرمایا" رہا میرا عذاب تو میں جس پر چاہتا ہوں اس پر نازل کرتا ہوں، اور رہی میری رحمت تو وہ (عالم کی) ہر چیز پر سایہ افگن ہے۔ پس میں اپنی رحمت کو (روز آخرت) صرف ان لوگوں کے لیے خاص کر دوں گا جو (اس دنیا میں) خدا سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ ہے خدا کا قانونِ عدل و رحمت جس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ یہ قانونِ عدل و رحمت غیر متبدل ہے، ممکن نہیں کہ اس میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر واقع ہو جائے۔ وہ انسانوں کے قانونِ عدل و رحمت کی طرح نہیں ہے کہ عدل کا جامہ اتار دیا تو عفو و بخشش کا ہر دروازہ بند کر کے خوں ریزی اور ستم رانی پر اتر آئے، اور اگر رحمت کا لبادہ اوڑھ لیا تو عدل و انصاف کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ خدا کا قانونِ عدل و رحمت اس طرح کی بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ روز آخرت عدل کے نام پر نہ کوئی ظلم و ستم ہوگا، اور نہ رحمت کے نام پر عدل و انصاف کا خون ہوگا۔ جیسا اور جتنا کچھ کسی نے کیا ہوگا اسی کے مطابق ویسا ہی اور اتنا ہی اس کے ساتھ پیش آئے گا، دوسرے لفظوں میں جو کچھ بویا ہوگا وہی کاٹے گا۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے جنّت اور جہنّم اور دیگر امور متعلقہ کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت یقینیات کی نہیں بلکہ تمام تر قیاسی ہے جو قرآن مجید کے الفاظ اور جملوں کے مجمل اشارات سے ماخوذ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنّت اور جہنّم کی اصل حقیقت ہمارے لیے ایک رازِ سربستہ ہے اور انسانی عقل و فکر کے ناخن سے اس کی گرہ کشائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ جنّت اور جہنّم دونوں ہی جیسا کہ ہم گزشتہ سطروں میں بیان کر چکے ہیں، ہمارے اعمال کے دو مختلف نتائج ہیں۔ اچھے اور راحت بخش نتیجے کو جنت سے، اور برے اور تکلیف دہ نتیجے کو جہنّم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایمان وعمل کا قرآنی تصور

الطاف احمد اعظمی